۱۶ نومبر ۲۰۲۰ء | جلد نمبر: ۱۳ ۔ شمارہ نمبر: ۲۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱_۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطہ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

فرانس بڑبن کا مظاہرہ کرے!

Yvonne Ridley

ایسا لگتا ہے کہ فرانس کے صدر ایمانویل میخواں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ محمدؐ کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کی حمایت اور مجموعی طور پر اسلام کا تمسخر اڑانے سے مسلم دنیا میں جو شدید ردِعمل پیدا ہوا ہے اس کا ازالہ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے مسلم دنیا کے مقبول ترین رہنما رجب طیب ایردوان سے بھی مخاصمت مول لی ہے۔ یہ کہنا اس وقت ذرا مشکل ہے کہ صدر میخواں واقعی اپنے کہے اور کیے پر شرمندہ ہیں اور تلافی کرنا چاہتے ہیں یا پھر انہیں مسلم دنیا کی طرف سے بائیکاٹ کی صورت میں فرانس کی معیشت کو پہنچنے والے موجودہ اور ممکنہ نقصان کی زیادہ فکر لاحق ہے اور ساتھ ہی ساتھ اگلے انتخابات میں اپنے امکانات کی بھی۔

فرانس کے صدر نے الجزیرہ ٹی وی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں اندازہ ہے کہ محمدؐ کے خاکوں کی اشاعت سے اسلامی دنیا میں جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ انٹرویو کے لیے الجزیرہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے، تاکہ مسلم دنیا کو پیغام ملے۔

فرانس میں بحران اسکول ٹیچر سیموئل پیٹی کا سر تن سے جدا کیے جانے سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس سے دو ہفتے قبل منظور کیے جانے والے ان قوانین کے بطن سے پیدا ہوا جن کے تحت علیحدگی پسند رجحانات کی مانیٹرنگ کے نام پر فرانس بھر کے مسلمانوں پر نظر رکھنے کی تیاری کر لی گئی ہے۔

صدر ایمانویل میخواں نے عوام کا مزاج سمجھنے میں ایک بار پھر غلطی کر دی ہے۔ اس سے قبل انہوں نے معاشی ناہمواری اور ناانصافی کے خلاف شروع کی جانے والی پیلی جیکٹ تحریک کے دوران بھی عوام کا مزاج سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ بعد میں انہوں نے ووٹروں کے سامنے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری وہ قبول کرتے ہیں۔ عوام کے لیے جینا مشکل ہو گیا ہے تو اس کے لیے وہ بھی ذمہ دار ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی تین برس پڑے ہیں اور اس دوران معاملات درست کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ پیلی جیکٹ تحریک اصلاً ایندھن کے نرخوں میں اضافے کے خلاف تھی، مگر بہت جلد یہ تمام بنیادی معاملات پر محیط ہو گئی۔ فرانس کے محنت کشوں اور غریبوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ صدر میخواں صرف اشرافیہ کے نمائندے ہیں۔ فرانس میں انتخابات ۲۰۲۲ء میں ہوں گے۔ تب تک صدر میخواں کو دنیا بھر کے ایک ارب ۸۰ کروڑ مسلمانوں سے نمٹنا ہے۔

الجزیرہ کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر میخواں نے یہ بھی کہا کہ محمدؐ کے خاکوں کی اشاعت اور اسلام کے حوالے سے ان کے الفاظ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ خاکے ایک آزاد و خودمختار میڈیا آؤٹ لیٹ نے شائع کیے ہیں۔ انہوں نے اس امر پر تاسف کا اظہار کیا کہ دہشت گردی کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کے نام پر دہشت گردی اور ایسے ہی دیگر جرائم دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہیں۔

اس انٹرویو کے دوران صدر میخواں نے غصہ دکھایا نہ مشتعل ہوئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دہشت گردی پر مبنی واقعات کو دبا دیا جائے۔ ان واقعات نے فرانس میں اور فرانس کے باہر ہر ذی فہم کو شدید الجھن سے دوچار کیا ہے۔ تیونس سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے نائس شہر میں تین افراد کو قتل کیا۔ پیرس میں ایفل ٹاور کے نزدیک دو باحجاب بہنوں پر چھریوں سے وار کیے گئے۔ پھر اسکول ٹیچر سیموئل پیٹی کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ایوگیوں شہر میں پولیس نے شمالی افریقا سے تعلق رکھنے والے ایک دکاندار کو دھمکانے والے مسلح شخص کو گولی مار دی۔ کہا گیا کہ اللہ اکبر کا نعرہ سنا گیا تھا۔ منٹوں میں میڈیا نے اس معاملے کو مسلم انتہاپسندی سے جوڑ دیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ بات طشت از بام ہو گئی کہ پولیس کے ہاتھوں مارے جانے والے دہشت گرد کا تعلق انتہائی دائیں بازو کی تنظیم "جنریشن آئڈنٹٹی" سے تھا۔ یہ تنظیم تارکین وطن کی آمد اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ یہ تنظیم سفید فام نسل کی برتری کی علم بردار ہے اور اس کا کہنا ہے کہ غیر سفید فام تارکین وطن کی آمد سے سفید فام نسل کی برتری داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

اگر صدر میخواں اپنے کہے اور کیے کے حوالے سے واقعی

اندرونی صفحات پر:۔

- آرمینیا سے امن معاہدہ۔ آذربائیجان کی فتح
- بھارت نازی ازم سے متاثر فاشسٹ ریاست ہے!
- جمال خاشقجی کا "بھوت"
- نئی امریکی انتظامیہ اور ترجیحات
- بھارتی مسلمان ووٹر: متبادل حکمت عملی کی ضرورت
- ترقی پسندی
- نگورنو کاراباخ: سہ فریقی معاہدے کا متن
- سیموئیل پیٹی کا قتل: مسلمانوں کو ٹھیس پہنچانے کا ایک ہتھیار

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

سنجیدہ اور رنجیدہ ہیں اور معاملات کو تیزی سے درست کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ اعلان کرنا پڑے گا کہ اب گستاخانہ خاکے فرانس کا کوئی بھی پبلشر نہیں چھاپے گا اور ملک بھر میں کسی بھی دیوار پر یہ خاکے نہیں لگائے جائیں گے۔ ایسا کرنا کسی بھی سطح پر اعترافِ جرم نہیں کہلائے گا بلکہ یہ سب کچھ یہ تسلیم کرنے کی خاطر ہوگا کہ فرانسیسی صدر کے ریمارکس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی ہے۔ اس سے اظہارِ رائے کی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آئے گا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ فرانس کے سیاست دانوں نے ۲۰۰۹ء میں اس وقت بھی احتجاج کیا تھا جب اس وقت کے فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کے بیٹے اور ایک مالدار یہودی خاتون کے تعلق کے حوالے سے چارلی ہیڈو کے لیے خاکے بنانے والے فنکار مارس سنیٹ کو برطرف کر دیا گیا تھا۔

انتہاپسند تو کم و بیش ہر مذہب کے پیروکاروں میں ہیں، مگر ایسا لگتا ہے کہ سازش کے تحت فرانس میں صرف مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے، اسلامی تعلیمات کا تمسخر اڑایا جارہا ہے۔ ستمبر میں ایسے قوانین وضع کیے گئے، جن کے تحت ملک بھر میں مقامی انتظامیہ کو اختیار دیا گیا کہ کسی بھی مسلم تنظیم کو قانونی عمل کے بغیر تحلیل کر دیں۔ صدر میخواں انقلاب مخالف منصوبوں کے لیے بہتر فنڈنگ کی خاطر فرانس سے حج پر جانے والوں سے اضافی ٹیکس وصول کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نئے قوانین کے تحت مذہبی تنظیموں کو کسی بھی غیر مذہبی تقریب کے انعقاد سے روکا جاسکے گا۔

صدر میخواں کا منصوبہ ہے کہ ٹیکس، سلامتی اور قانون پسندی کے حوالے سے تمام مسلم تنظیموں پر نظر رکھی جائے۔ حکومت کا ساتھ نہ دینے والی تنظیموں کو کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔ اسی طور اسلاموفوبیا کی نشاندہی کرنے یا ایسے واقعات ریکارڈ کرنے والی تنظیموں کو بھی مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

ان سطور کے لکھے جانے تک فرانس بھر میں مسلمانوں کے ہاتھوں چلائی جانے والی ۵۰ خیراتی تنظیموں سے تفتیش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی ۷۰ کمپنیاں اور اسکول بند کیے جاچکے ہیں۔ درجنوں مسلمانوں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے ہیں اور وزیر داخلہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ان چھاپوں کا سیموئل پیٹی کے قتل کی تحقیقات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ چھاپے فرانس کے ۶۰ لاکھ مسلمانوں کو ''پیغام'' دینے کے لیے تھے۔

فرانسیسی صدر کے بھیانک ترین اقدام کا تعلق بنیادی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی دو تنظیموں کو ریاست کی دشمن قرار دینے سے ہے۔ ''دی کلیکٹیو اگینسٹ'' اسلاموفوبیا اِن فرانس (سی سی آئی ایف) سے متعلق واقعات ریکارڈ کرتی ہے۔ ''برکہ سٹی'' خیراتی ادارہ ہے، جو عطیات وصول کرکے کام کرتا ہے۔ سی سی آئی ایف کو اقوامِ متحدہ کے تحت بھی خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ یورپ میں سلامتی و تعاون کی تنظیم کے فریم ورک کے تحت یہ ایک اہم غیر سرکاری تنظیم ہے۔ یورپ بھر میں اس تنظیم کی معاونت کرنے والے موجود ہیں۔ اس تنظیم نے نسل پرستی اور امتیازی سلوک کا نشانہ بننے والے ہزاروں افراد کی مدد کی ہے۔ برکہ سٹی نے دنیا بھر میں لاکھوں افراد کو افلاس کے دائرے سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور پینے کے صاف پانی تک انتہائی پس ماندہ طبقے کی رسائی ممکن بنائی ہے۔ برکہ سٹی کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں مگر پھر بھی اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

برکہ سٹی کے سربراہ ادریس سہامدی نے اعلانیہ طور پر ترکی سے کہا ہے کہ وہ انہیں اور ان کی تنظیم سے وابستہ سرکردہ افراد کو پناہ دے۔ اس کے لیے انہوں نے ٹوئٹر کا سہارا لیا ہے۔ واضح رہے کہ فرانس کے طول و عرض میں اس تنظیم کے خلاف کریک ڈاؤن جاری ہے۔ ہراساں کرنے اور انتہاپسندی پھیلانے کے الزام میں انسدادِ دہشت گردی پولیس نے تین ہفتے قبل ادریس سہامدی کے گھر پر چھاپا مارا تھا۔ انہوں نے ایک ٹویٹ میں ترک صدر رجب طیب ایردوان سے گزارش کی کہ انہیں ترکی میں پناہ دی جائے کیونکہ ان کی بھی زندگی خطرے میں ہے اور ساتھیوں کی بھی۔

صدر میخواں کہتے ہیں کہ اسلام بحران کی زد میں ہے۔ اسلام نہیں بلکہ صدر میخواں کی پالیسی کے ہاتھوں فرانس کے مسلمان بحران سے دوچار ہیں۔ اگر صدر میخواں واقعی شرمندہ ہیں اور اپنے ریمارکس کے ہاتھوں الجھ جانے والے معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے فرانسیسی مسلمانوں پر مشتمل مشاورتی گروپ تشکیل دینا ہوگا۔ انہیں یہ بات سمجھنا ہوگی کہ مسلمانوں سمیت کسی کی بھی توہین محض اس لیے نہیں کی جانی چاہیے کہ توہین کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا ایک بڑی جمہوریت کے صدر کے منصب کو زیبا نہیں۔

فرانس کے باشندوں سے نوآبادیاتی دور کے مظالم پر معافی مانگنے کا بھی یہی وقت ہے۔ الجزائر پر فرانس کے ۱۳۰ سالہ قبضے کے دوران وہاں کے باشندوں کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ صدر میخواں اور ان کے ساتھی آج جس آزادی کے گن گاتے نہیں تھکتے، اسی آزادی کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں الجزائر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور پھر ان میں سے بہت سوں کے سر ''ٹرافی'' کے طور پر کاٹ کر محفوظ کیے گئے۔

آزادی اور اخوت فرانس کا ایک بنیادی نعرہ اور اصول ہے۔ اس نعرے کا اطلاق نسلی، ثقافتی اور سیاسی امتیاز کے بغیر کیا جانا چاہیے۔ ایسا نہ کیے جانے کی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ آزادی کا نعرہ غریبوں اور مظلوموں کو دبوچ کر رکھنے کے ہتھکنڈے کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ فرانس کی حکومت جمہوریت کے انتہائی بنیادی اصولِ آزادی کو سمجھے اور اس پر عمل بھی کرے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"France should grow up and apply liberte, eglite and fraternite to all of its citizen".

("middleeastmonitor.com". November 1, 2020)

●●●

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتاب

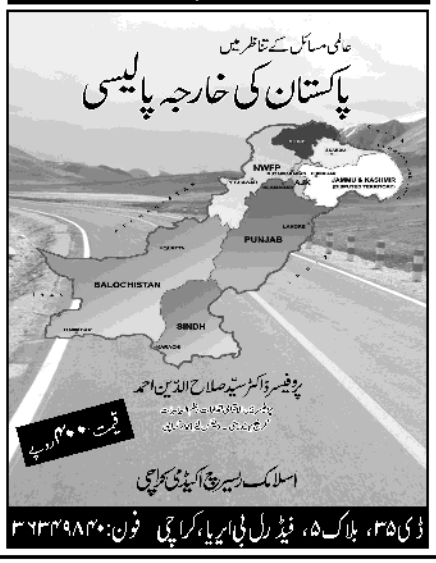

ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتاب

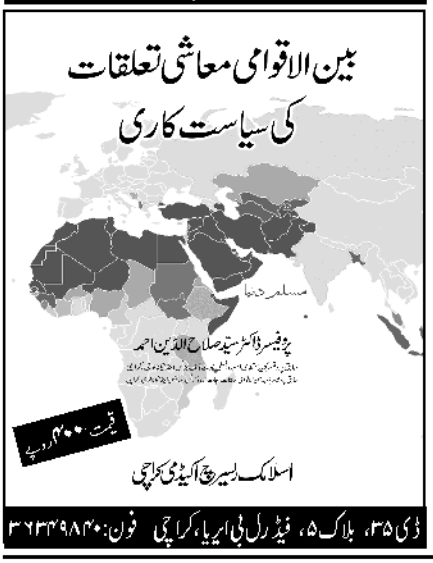

ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰

آرمینیا سے امن معاہدہ۔۔آذربائیجان کی فتح

ابو عادل

آذربائیجان کا کہنا ہے کہ اس نے نگورنو کاراباخ کے آس پاس کے ان بیشتر علاقوں کو حاصل کرلیا ہے جو ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۴ء کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اس جنگ میں تقریباً ۳۰ ہزار افراد ہلاک اور لاکھوں بے گھر ہوگئے تھے۔ حالیہ جنگ کے دوران تین بار معاہدہ جنگ بندی کا اعلان ہوا لیکن جنگ روکنے میں کامیابی نہیں مل سکی تھی، تاہم اب فریقین میں ایک معاہدہ کے تحت کاراباخ کا علاقہ دوبارہ آذربائیجان کو واپس حاصل ہوجائے گا۔

آذربائیجان کے صدر الہام علی یوف، آرمینیا کے وزیر اعظم نیکول پاشنیان اور روسی صدر پوٹن نے نگورنو کاراباخ جنگ بندی معاہدہ ۲۰۲۰ء کا اعلان کیا، جس کا متن آذربائیجان کے حق میں ہے۔ معاہدے کے مطابق لڑائی کے دوران قبضے میں لیے گئے علاقے آذربائیجان کے پاس رہیں گے، اس میں شوشا نامی مرکزی قصبہ بھی شامل ہے، جو بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے عسکری نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نگورنو کاراباخ کے بعض علاقوں سے انخلا کے ٹائم ٹیبل پر بھی اتفاق کرلیا گیا ہے۔ نگورنو کاراباخ میں ۲۷ ستمبر ۲۰۲۰ء سے تقریباً چھ ہفتے (ڈیڑھ ماہ) تک خونریز لڑائی کے بعد جنگ بندی کا معاہدہ armistice ایک ایسے وقت کیا گیا ہے، جب آذربائیجان کی فوج مسلسل کامیابیوں کے ساتھ آرمینیائی فوجوں کو پسپا کرتی ہوئی انھیں آرمینیا کی جانب تیزی سے دھکیل رہی تھی۔ اس جنگ میں ایک اندازے کے مطابق ۳۰۰۰ سے زیادہ عام لوگ اور فوجی ہلاک ہوئے، جس میں آرمینیا کا آذربائیجان کے مقابلے میں کہیں زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ نگورنو کاراباخ علاقے کے آرمینیائی رہنما اریاک ہروتیونیان نے بھی کہا کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، جنگ بندی کے معاہدے سے اتفاق کرلیا جانا چاہیے۔

آرمینیا کے ۲۰۱۹ء سے چلے آرہے ۴۵ سالہ وزیر اعظم نیکول پاشنیان نے اس معاہدے کو اپنے اور اپنے لوگوں کے لیے ناقابل حد تک تکلیف دہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا ''میدانِ جنگ کی صورتحال، زمینی حقائق اور اس سے متعلق بہترین ماہرین کے عمیق تجزیے اور صلاح ومشورے کی بنیاد پر جنگ بندی کے معاہدے کا فیصلہ کیا گیا۔ اگر اس وقت جنگ بندی کے معاہدہ کو قبول نہ کیا جاتا تو مزید پسپائی اور علاقوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کا قوی امکان تھا۔ یہ ایک فتح تو نہیں لیکن جب تک آپ اپنے کو شکست خوردہ تسلیم نہ کریں تب تک یہ ہار بھی نہیں ہے۔ ہم کبھی بھی اپنے آپ کو شکست خوردہ نہیں سمجھیں گے اور یہی ہمارے قومی اتحاد اور ایک نئے عہد کا آغاز ثابت ہوگا''۔

یاد رہے! دریائے ڈینیوب اور بحیرہ اسود کے شمال میں پھیلا ہوا علاقہ 'مشرقی یورپ' کہلاتا ہے۔ جب کہ 'جنوبی قفقاز' مشرقی یورپ اور جنوب مغربی ایشیا کی سرحد پر واقع ایک جغرافیائی و سیاسی خطہ ہے۔ آذربائیجان اور آرمینیا ۱۹۲۲ء سے ۱۹۹۱ء تک قائم رہنے والے کمیونسٹ ملک سوویت یونین (موجودہ روس) کا حصہ تھے۔ آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان ۱۹۹۰ء کے عشرے سے نگورنو کاراباخ کا علاقہ تنازع چلا آرہا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان اس علاقے کو حاصل کرنے کے لیے ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں بھی شدید جنگیں ہوچکی تھیں۔ ۱۹۸۸ء میں اس علاقہ میں آرمینیائی فوج نے حملہ کرکے مسلمانوں کا قتل عام بھی کیا تھا۔ واضح رہے کہ آذربائیجان میں قریباً ۹۶ فیصد آبادی مسلمان ہے، نگورنو کاراباخ کا علاقہ عالمی سطح پر آذربائیجان کا حصہ تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کا انتظام آرمینیائی نسل کے لوگوں یعنی عملاً آرمینیا کے پاس رہا۔ کوہ قفقاز (کاکیشیا) میں آرمینیا کی سرحد سے ۵۰ کلومیٹر دور یہ علاقہ ۴۴ سو مربع کلومیٹر پر محیط ہے۔ ۹۲۔۱۹۹۱ء میں آرمینیائی فوج کی مدد سے روسی افواج کی ۳۶۶ بریگیڈ بھی کاراباخ کے علاوہ آذربائیجان میں اندر تک گھس آئے تھے۔

اس معاہدہ کے مطابق دونوں ممالک کے درمیان فرنٹ لائن پر روسی امن فوجی دستے تعینات کیے جائیں گے۔ روس اس علاقے میں ۱۹۶۰ فوجی اور ۹۰ بکتر بند گاڑیاں بطور امن فوج تعینات کرے گا۔ آذربائیجانی صدر علی یوف کے مطابق ان کا اتحادی ترکی بھی قیام امن کی کوششوں میں کردار ادا کرے گا، تاہم مذکورہ معاہدہ میں ترکی کے کسی کردار کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ ترک وزیر دفاع جنرل ریٹائرڈ ہولوسی آکار اور روسی ہم منصب سرگئی شوگو نے کاراباخ کی نگرانی کی یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ اور روسی وزیر خارجہ سرگئی لیوروف کے مطابق اس یادداشت پر روس اور ترکی نے اتفاق کیا ہے۔

روسی وزارت خارجہ کے ترجمان دمتری پسکو کا کہنا ہے کہ روس، آرمینیا، آذربائیجان کے مشترکہ بیانیے میں ترک امن دستوں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی گئی۔ پسکو نے یہ بھی کہا کہ صدر پوتن اپنے ترک ہم منصب صدر ایردوان کے تعمیری نقطہ نظر کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

آرمینیا، روس اور آذربائیجان کے سربراہان حکومت کے مابین طے پانے والے اس سہ فریقی معاہدہ کا نفاذ منگل ۱۰ نومبر ۲۰۲۰ء سے ہوگیا ہے۔ معاہدے سے چند روز قبل روس نے انکشاف کیا تھا کہ آرمینیا کی سرزمین پر آذربائیجان کی سرحد کے پاس اس کا ایک فوجی ہیلی کاپٹر روسی فوجیوں سمیت مار گرایا گیا تھا۔ آذربائیجان کی فوج نے روس سے اس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت کی تھی۔ سوویت یونین کے دور کے خاتمے کے بعد سے ہی روس کے آذربائیجان اور آرمینیا کے ساتھ قریبی تعلقات رہے ہیں۔ کاراباخ کے معاملے میں روس آرمینیا کا اتحادی ہے جبکہ ترکی آذربائیجان کا حامی ہے۔ روسی امن فوج ۵ برس کے لیے اس علاقے میں تعینات رہیں گے اور جنگ بندی کی نگرانی کریں گی۔ روس کے امن فوجیوں کی علاقے میں آمد شروع ہوچکی ہے۔ انہوں نے ''درہ لاشین'' کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔ یہ پہاڑی گزرگاہ آرمینیا اور نگورنو کاراباخ کے درمیان واقع ہے۔

یاد رہے! مذکورہ سہ فریقی معاہدہ درحقیقت ایک ''آرمسٹائس'' ہے جو باضابطہ معاہدہ کی ایک خاص صورت ہے۔ بین الاقوامی قوانین کی رو سے ''آرمسٹائس'' ایک عارضی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد مستقل امن کے لیے معاہدے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ آرمسٹائس دو متحارب گروہوں کے مابین لڑائی روکنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ضروری نہیں ہوتا کہ جنگ کا بالکل خاتمہ ہوجائے بلکہ یہ ایک modusvivendi ہے یعنی یہ امن معاہدے اور جنگ بندی کی محض ایک ابتدائی صورت ہے۔ جب کہ اس کے برعکس امن معاہدہ میں مہینوں اور سال بھی لگ سکتے ہیں۔ یہ دو لڑنے والے فریقوں کے مابین 'فوری و وقتی' جنگ بندی ہے تاکہ بات چیت شروع کی جاسکے۔ اس کی ایک مثال ۱۹۵۳ء کا ''کوریائی آرمسٹائس'' یا معاہدہ ہے۔ اسی طرح ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں (جنگ عظیم اول کے دور میں) سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ مغربی اتحادیوں کی جنگ ختم کرنے والا معاہدہ،

Armistice of Mudros تھا، جو سابقہ عثمانیوں (ترکوں) کے لیے انتہائی سخت و ظالمانہ تھا۔ یہ آرمسٹائس یونان کی بندرگاہ مدروس پر ایک بحری جہاز میں ہوا۔ معاہدہ مدروس میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے بحری امور کے وزیر رؤف بے کی زیر قیادت سہ رکنی وفد اور اتحادیوں کی طرف سے برطانوی ایڈمرل سمرسیٹ آرتھر گف کالتھورپ کے درمیان شرائط طے پائیں۔ تاہم یہ معاہدہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آذربائیجان اور ترکی کو اس معاملہ پر اپنی مستقل و پائیدار گرفت برقرار رکھنے کے لیے اپنی کوششوں کو مستقل جاری رکھنے اور کسی بھی وقت کسی خوش فہمی کا شکار ہونے سے بچنے کی ضرورت ہے۔ واضح رہے! آرمینیا ئی وزیراعظم نے اس عزم کا اظہار کیا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ شوشا اور کاراباغ کو آذری قبضہ میں ہے رہنے دے گا بلکہ ہم آذربائیجان کی طرح تیاری کرکے اسے دوبارہ حاصل کرلیں گے۔

آذربائیجان کی فوج نے جنوبی قفقاز میں آرمینیائی قبضے سے ۱۳ دیہاتوں کو آزاد کروایا تھا۔ الہام علی ئیوف نے ٹویٹر پر کہا: آذربائیجان کی شاندار فوج نے Khojavend، کے Dolanar اور Bunyadli گاؤں، Jabrayil کے Dag گاؤں اور Zengilan کے Venedli اور Mirzehasanli کے گاؤں کو آزاد کرایا۔ بعدازاں علیوف نے ٹویٹ کیا کہ فوج نے Gubadli کے Zilanli، Mahrizli Kurd، Muganli اور Alagurshag گاؤں بھی آزاد کروا لیے ہیں۔ Agdam آذربائیجان کا شہر ہے۔ ۱۹۹۳ء میں نگورنو کاراباخ کی جنگ میں آرمینائی افراد کے ہاتھوں آذری لوگوں کے قتل اور دباؤ کے باعث آذری یہ شہر خالی کرگئے باوجود اس کے کہ یہ شہر جنگ میں شامل نہ تھا۔ بین الاقوامی اداروں کی رپورٹس کے مطابق اس شہر اور اس کے ثقافتی ورثے کو آرمینائی لوگوں نے منصوبہ بند انداز میں تباہ و برباد کیا۔ یہ شہر بالکل خالی کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے اسے 'بھوت شہر' بھی کہا جانے لگا۔ اس کی مرکزی مسجد کو جانوروں کا باڑہ بنادیا گیا۔ تاہم حالیہ ۲۰۲۰ء کی نگورنو کاراباخ ڈیڑھ ماہ جاری رہنے والی جنگ کے بعد آذربائیجان کی آرمینیا کے خلاف کامیابی کے بعد اس علاقے میں ایک بار پھر 'اللہ اکبر' کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوگئیں ہیں۔ تین دہائیاں قبل چھن جانے والا شہر Shusha واپس لے لیا گیا۔ نگورنو کاراباخ کے اس شہر کی فضا ۱۹۹۲ء کے بعد پہلی مرتبہ اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ ۲۸ سال قبل آرمینیا کی عملداری کے دوران شوشا میں اذان بند کردی گئی تھی۔ حالیہ سہ فریقی معاہدہ کے مطابق یہ قصبہ اور اس کے ملحقہ اضلاع باقاعدہ طور پر ۲۰ نومبر ۲۰۲۰ء کو دوبارہ آذربائیجان کے سپرد کردیے جائیں گے۔

ترک صدر طیب ایردوان نے کہا ہے کہ انقرہ اور ماسکو ایک ساتھ مل کر اس مشترکہ مرکز سے اس جنگ بندی کی نگرانی کریں گے، جسے آذربائیجان نے آرمینیا کے قبضے سے چھڑانے والے علاقوں میں نامزد کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل انتونیو گوتیرس کے ترجمان اسٹیفین دوجارک نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ''سیکرٹری جنرل کو اس بات پر اطمینان ہے کہ دشمنی کے خاتمے کے لیے ایک معاہدہ (armistice) طے پا گیا ہے۔ اس سلسلے میں روس کی کوشش کے لیے ہم بے حد شکرگزار ہیں۔ حقیقی معنوں میں تو اطمینان اس بات پر ہے کہ اس سے عام شہریوں کے مسائل اور مصائب کے ختم ہونے کے توقعات وابستہ ہوگئے ہیں''۔

فرانس جو کہ ترکی کا موجودہ حریف اور آرمینیا کا حلیف ملک ہے اس کی جانب سے کہا گیا کہ دشمنیوں کا خاتمہ انتہائی اہم تھا۔ انہوں نے آذربائیجان سے معاہدے کی شرائط پر عمل کرنے کی اپیل کی اور آرمینیا کے ساتھ اپنی دوستی کی تصدیق کی۔

ایران جو کہ آذربائیجان کا پڑوسی اور آرمینیا کا حلیف ملک ہے، اس نے معاہدے کا خیرمقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ اس سے ایک حتمی تصفیہ ہوجائے گا، جس سے خطے میں پائیدار امن قائم ہوگا۔

روس جو کہ ان دونوں ملکوں پر ستر سال سے زائد قابض رہا، اس کا کہنا تھا کہ ''ہم امید کرتے ہیں کہ ہونے والے ان معاہدوں سے ہم نگورنو کاراباخ بحران کے کسی مستقل و منصفانہ حل کی جانب پیش رفت کرسکیں گے، جو کہ آرمینیا اور آذربائیجان کے لوگوں کے مفاد میں بھی ہو''۔ جنگ بندی کے اس تازہ معاہدے پر آرمینیا میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ دارالحکومت یریوان میں احتجاجی مظاہرین نے وزیراعظم کا استعفیٰ مانگتے ہوئے اسے غدار قرار دیا۔ مشتعل افراد نے پارلیمان میں گھس کر توڑ پھوڑ کی اور پارلیمان کے صدارت مرزویان پر تشدد کرکے ادھ موا کردیا۔ آرمینائی وزیراعظم نے مستعفی ہونے کے مطالبے کو مسترد کردیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف آرمینیائی قبضے سے نگورنو کاراباخ کا علاقہ حاصل کرنے پر آذری عوام سڑکوں پر نکل آئے اور جشن منایا، نوجوانوں نے ترکی اور پاکستان کے پرچم لہرا کر رقص کیا۔ آذری صدر کا خطاب سننے کے بعد لوگوں کا ہجوم سڑکوں پر امڈ آیا اور خوشی میں نعرے بازی کی۔ اس موقع پر عوام نے سڑکوں پر روایتی رقص کیے اور لوک گیت گائے۔ آذری عوام نے کاراباخ ہمارا تھا اور ہمارا ہے، کے نعرے لگائے اور مرحوم صدر حیدر علی الیف کے مزار تک مارچ کیا۔ آذربائیجان کے لوگ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نے سفارتی محاذ پر ان کی مدد کی ہے، اس لیے وہ پاکستان کو تکریم دے رہے ہیں۔ آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان نگورنو کاراباخ پر تنازع کی وجہ سے پاکستان نے ابھی تک آرمینیا کو سفارتی طور پر تسلیم نہیں کیا۔ پاکستان میں آذربائیجان کے سفیر علی علی زادہ کا کہنا ہے کہ آذربائیجان کا پرچم پاکستان اور ترکی کے پرچموں کے بنا ادھورا ہے۔ آذربائیجان کے قومی پرچم کی ۱۰۲ ویں سالگرہ کے موقع پر ٹویٹر پر اپنے پیغام میں انہوں نے لکھا ''ترکی اور پاکستان نے جنگ میں ہماری بھرپور حمایت کی''۔ پاکستانی وزارتِ خارجہ کے ترجمان زاہد حفیظ نے آرمینائی مقبوضہ علاقہ کاراباخ کے بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے متعلقہ فیصلوں کے مطابق کاراباخ کے دوبارہ آذربائیجان میں شامل ہوجانے پر بلکہ آزاد کرانے پر آذربائیجان کے عوام اور حکومت کو مبارکباد پیش کی۔ جنگ بندی پر اظہارِ مسرت کیا۔ خیال رہے! آذربائیجان کشمیر کے تنازع پر پاکستان کے موقف کا حامی ہے۔

●●●

بقیہ: جمال خاشقجی کا ''بھوت''

کو روکنے کے لیے واقعی میں اپنے بڑے شہروں کو تالا لگانا پڑا۔ چھ سال سے جاری احتجاج مسلسل نئی شکل لے رہا ہے اور سیاسی تبدیلی کا بھرپور امکان موجود ہے، یہ تبدیلی سوڈان اور الجیریا میں پہلے ہی آچکی ہے۔ تاریخ ایک بار پھر نیا موڑ لے رہی ہے، مطلق حکمران اور فوجی آمر تاریخی طور پر غلط جگہ کھڑے ہیں، خاشقجی کوئی انقلابی نہیں تھا، وہ خود سعودی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ رہ چکا تھا، وہ جدید سوچ رکھنے والی شخصیت تھے، مجھے نہیں لگتا کہ انہوں نے کبھی سوچا بھی ہوگا کہ ان کی موت اس طرح کے اثرات پیدا کرے گی۔ خاشقجی کو کبھی بھلایا نہیں جاسکے گا، ایک ایسا شخص جس نے اپنے ملک میں آزادئ اظہار کے لیے مہم چلائی، یہ مہم وقت کے ساتھ تیز ہوتی جائے گی۔ انہوں نے اپنے کالموں کے ذریعے بے مثال صحافتی طاقت کا مظاہرہ کیا اور اس کے لیے اپنی جان بھی دے دی، محمد بن سلمان نے خاشقجی کی قسمت نہیں بلکہ اپنی قسمت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگادی ہے۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Jamal Khashoggi's long shadow".
("middleeasteye.net".)

بھارت نازی ازم سے متاثر فاشسٹ ریاست ہے!

پاکستان کے وزیراعظم عمران خان سے جرمن جریدے ڈیر اسپیگل کا خصوصی انٹرویو

پاکستان کے ۶۸ سالہ وزیر اعظم عمران خان نے حال ہی میں معروف جرمن جریدے "ڈیر اسپیگل" (Der Spiegel) کو خصوصی انٹرویو دیا۔ ڈیر اسپیگل کی نمائندہ Susanne Koelbl کو دیے گئے اس انٹرویو میں انہوں نے عالمی سیاست میں پاکستان کے کردار، چینی قیادت کے لیے اپنی پسندیدگی اور متعدد معاملات میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے اپنی مماثلت پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔

عمران خان کسی زمانے میں کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتنے والی پاکستانی ٹیم کے کپتان تھے اور ان کا ایک امیج پلے بوائے کا بھی تھا۔ انہوں نے کم و بیش دو عشروں کی محنت کے نتیجے میں خود کو ایک مخلص اور آمادہ بہ کار سیاست دان میں تبدیل کیا ہے۔ وہ بیک وقت کئی بحرانوں اور چیلنجوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ پاکستان کی معیشت اس وقت بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ اپوزیشن عمران خان اور فوج کے خلاف متحد ہو چکی ہے۔ اس وقت پاکستانی حکومت امریکی اسٹیبلشمنٹ اور افغان طالبان کے درمیان مذاکرات میں ثالث کا کردار ادا کر رہی ہے۔ کئی پرتشدد واقعات کے باعث امریکا طالبان مذاکرات میں کئی بار رخنہ پڑا ہے۔ ایسے میں عمران خان کو سکون کا سانس فراہم کرنے کا موقع دینے والی واحد بڑی حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھلے ہی کورونا وائرس سے غیر معمولی حد تک پریشان ہوئی ہو، پاکستان میں کورونا وائرس سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد خاصی حوصلہ افزا حد تک کم رہی ہے۔ آپ سے کیا گیا انٹرویو پیش خدمت ہے:

ڈیر اسپیگل: پاکستان کی آبادی کم و بیش ۲۲ کروڑ ہے مگر کورونا وائرس سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد ۲۷۰۰ ہے۔ پڑوس میں تو بہت زیادہ ہلاکتیں واقع ہوئی ہیں۔ پاکستان ایسا کیا کر رہا ہے جو مختلف ہے اور کورونا وائرس سے دفاع کے معاملے میں اتنے حوصلہ افزا نتائج دے رہا ہے؟

عمران خان: پاکستان میں کم و بیش نصف آبادی یومیہ اجرت کی بنیاد پر جی رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں اسمارٹ لاک ڈاؤن متعارف کرانا پڑا۔ ہم صرف وہیں لاک ڈاؤن نافذ کرتے ہیں جہاں ہمیں غیر معمولی تعداد میں کیس سامنے آنے کا خدشہ ہو۔ ہم نے سپلائی لائنز کبھی بند نہیں کیں۔ ہم نے زرعی شعبے کو بند کیا ہی نہیں اور جیسے ہی معاملات بہتر ہوئے، صنعتی شعبے کو بھی کھول دیا۔ ہم نے تعمیراتی شعبہ کھولنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ شہری علاقوں میں یہ شعبہ لوگوں کو بہت بڑے پیمانے پر روزگار کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اسمارٹ لاک ڈاؤن نافذ کرنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری معیشت بالکل بیٹھ نہیں گئی۔ بھارت کی حکومت نے انتہائی افلاس زدہ طبقے کو گھروں تک محدود رکھا۔ یہ مکمل لاک ڈاؤن تھا جس کے خطرناک نتائج برآمد ہوئے۔ ایران کی طرح اب بھارت میں بھی افلاس کا گراف بلند ہو گیا ہے۔ مکمل لاک ڈاؤن کا یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔

ڈیر اسپیگل: ہر ہفتے کتنے لوگوں کا کورونا ٹیسٹ کیا جاتا ہے؟ کیا آپ کی حکومت ملک بھر میں کورونا وائرس کی وبا کے حوالے سے مکمل صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہے؟

عمران خان: ہر ہفتے کم و بیش ایک لاکھ ۸۰ ہزار سے ۲ لاکھ افراد کا کورونا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ ہماری قومی سطح کی رابطہ کمیٹی اس حوالے سے اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھتی ہے۔ حکومت کورونا وائرس پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے۔ جون میں دنیا بھر میں کورونا وائرس کی وبا نے انتہائی خطرناک شکل اختیار کی تھی مگر ہمارے ہاں صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ اموات میں بھی کمی واقع ہوئی۔ یہ سلسلہ اگست تک جاری رہا۔ ہمیں امید ہے کہ ہم کورونا کی وبا کی دوسری لہر کا بھی عمدگی سے سامنا کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

ڈیر اسپیگل: امریکا میں صدارتی انتخاب ہونے والا ہے؟ آپ کے خیال میں کس کی فتح کا امکان زیادہ ہے؟ ڈونلڈ ٹرمپ کا یا جو بائیڈن کا؟

عمران خان: رائے عامہ کے جائزوں میں سابق نائب صدر جو بائیڈن آگے ہیں مگر ڈونلڈ ٹرمپ کے بارے میں کچھ بھی پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ وہ عام سیاست دانوں سے ہٹ کر ہیں اور اپنے طے کردہ اصولوں کے مطابق کھیلتے ہیں؟

ڈیر اسپیگل: ایسا لگتا ہے کہ آپ انہیں پسند کرتے ہیں؟

عمران خان: میں نے پاکستانی سیاست میں اپنی پارٹی (پاکستان تحریکِ انصاف) متعارف کرائی اور ۲۲ سال کی مدت میں اسے ملک کی سب سے بڑی پارٹی میں تبدیل کیا ہے۔ میں بھی روایتی ڈگر سے ہٹ کر بہت کچھ سوچتا ہوں۔ سوشل میڈیا پر انحصار پذیر ہونے میں بھی ہم نے پہل کی اور نوجوانوں کو سیاسی جلسوں اور جلوسوں کی طرف لانے میں بھی ہم نے نہ صرف پہل کی بلکہ کامیابی بھی حاصل کی۔

ڈیر اسپیگل: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ میں اور ڈونلڈ ٹرمپ میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں؟

عمران خان: ہمیں چند ایک معاملات میں غیر روایتی ہونا ہی تھا تاکہ ہم دوسروں سے مختلف اور بہتر دکھائی دیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

ڈیر اسپیگل: آپ کس کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں؟

عمران خان: ہم چاہتے ہیں کہ بھارت کے معاملے میں امریکا ہم سے برابری کا سلوک کرے اور جہاں بھارت کے خلاف بولنا لازم ہو وہاں وہ ہمارے موقف کی تائید کرے، بالخصوص مقبوضہ کشمیر کی صورتِ حال کے حوالے سے۔ خطے میں غیر معمولی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ یہ کشیدگی کسی بھی وقت انتہائی خطرناک شکل اختیار کر سکتی ہے، دھماکا خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ امریکا میں خواہ کوئی صدر بنے، وہ چونکہ طاقتور ترین ملک ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلے میں بھارت کو بے جا طور پر ترجیح نہ دے، معاملات برابری کی سطح پر رکھے۔ امریکا کی سوچ یہ ہے کہ اگر وہ بھارت کو نوازے گا تو بھارتی اسٹیبلشمنٹ چین کو کنٹرول کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ یہ سوچ اصلاً غلط ہے۔ بھارت اب بھی پاکستان، چین، بنگلا دیش اور سری لنکا کے لیے خطرہ ہے۔ برصغیر میں سب سے زیادہ انتہا پسند اور نسل پرست حکومت بھارت میں ہے۔ بھارت ہر اعتبار سے ایک فاشسٹ ریاست ہے، جس نے

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشروں میں پروان چڑھنے والے نسل پرستانہ نظریے 'نازی ازم' سے تحریک پائی ہے۔

ڈیراسپیگل: یہ تو انتہائی درجے کا موازنہ ہے۔ کہیں آپ مبالغہ آرائی تو نہیں کر رہے؟

عمران خان: بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی سے ہے۔ یہ انتہاپسند جماعت ہے۔ اس کی نظریاتی اساس راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) ہے۔ اس انتہاپسند تنظیم نے اپنی تحریروں میں جرمن نازی آمر ایڈولف ہٹلر کو کھل کر سراہا ہے۔ جرمن نازیوں کو یہودیوں سے نجات پانے کا جنون تھا اور آر ایس ایس چاہتی ہے کہ بھارت کو مسلمانوں سے نجات مل جائے۔

ڈیراسپیگل: آپ نے کئی مواقع پر کہا ہے کہ واشنگٹن نے پاکستان کو ایک بے سمت جنگ میں خواہ مخواہ گھسیٹا۔ کیا آپ اس کی توضیح کریں گے؟

عمران خان: امریکا میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور واشنگٹن میں محکمہ دفاع پر ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو ہونے والے حملوں سے پاکستان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ القاعدہ افغانستان میں بہت پہلے سے تھی۔ نائن الیون کے بعد ہمیں اپنی فوج کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ملوث نہیں ہونے دینا چاہیے تھا۔ امریکا کے دباؤ کے آگے پرویز مشرف نے گھٹنے ٹیک دیے۔ میں اس جنگ میں پاکستان کے ملوث ہونے کے خلاف روزِ اول سے تھا۔

ڈیراسپیگل: تب طالبان کو پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی حمایت حاصل تھی۔ اسامہ بن لادن کو باضابطہ طور پر بین الاقوامی دہشت گرد قرار دیا جاچکا تھا اور طالبان اس کی میزبانی کر رہے تھے۔

عمران خان: یہ بات نہ بھولیے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اسامہ بن لادن ہیرو تھا۔ اس نے افغانستان میں سوویت افواج کے خلاف جاری جنگ میں مجاہدین کی بھرپور مدد کی تھی۔ تب اسامہ بن لادن کو سی آئی اے اور پاکستان دونوں کی حمایت حاصل تھی۔

ڈیراسپیگل: یہ تو نائن الیون سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔

عمران خان: طالبان کو تسلیم کرنا پاکستان کا حق تھا، مگر خیر ان پر پاکستان کا کنٹرول نہیں تھا۔ جب پاکستان نے طالبان سے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کریں تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈیراسپیگل: طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانے کے حوالے سے حال ہی میں امریکی صدر نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے طالبان سے قریبی روابط نہیں ہیں تو پھر آپ ایسا کرنے میں کیونکر کامیاب ہوئے؟

عمران خان: پاکستان میں کم و بیش ۲۷ لاکھ افغان پناہ گزین مقیم ہیں۔ اس حوالے سے ہماری کچھ تو بات بنتی ہے۔ اس قوت کو ہم ضرورت پڑنے پر استعمال کرتے ہیں۔ میں اس بات سے بہت خوش ہوں کہ ہماری کوششوں سے طالبان امریکا سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہوئے۔

ڈیراسپیگل: ایسا لگتا ہے کہ امریکا سے امن معاہدہ کرنے کے بعد طالبان کابل حکومت کے خلاف عسکری فتح کے بہت نزدیک ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ حکومتی نمائندوں سے گفت و شنید کا تاثر بھی دے رہے ہیں۔ کیا افغانستان ایک بار پھر سفاک بنیاد پرستوں کے ہاتھوں قائم ہونے والی آمریت سے بہت قریب ہے؟

عمران خان: میرا خیال ہے اس وقت کوئی بھی افغانستان کے بارے میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ افغانستان کے بعد سب سے زیادہ جسے امن کی ضرورت ہے وہ پاکستان ہے۔ ہم اس قضیے میں ۷۰ ہزار جانیں گنوا چکے ہیں۔ گزشتہ ۱۵ برس میں افغانستان سے ملحق ہمارے قبائلی علاقے تباہ ہو چکے ہیں۔ ان علاقوں کی نصف سے زائد آبادی بے گھر ہو چکی ہے۔ یہ تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ ہم نے جب سے حکومت قائم کی ہے، بات چیت پر زور دیتے آئے ہیں۔

ڈیراسپیگل: آپ نے حال ہی میں افغانستان کے ایک معروف مجاہد رہنما گلبدین حکمت یار کا خیر مقدم کیا۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ آپ نے امریکی افواج کا انخلا مکمل ہونے کے بعد افغانستان میں اقتدار کی تقسیم کے حوالے سے گلبدین حکمت یار سے بات چیت کی۔ آپ نے گلبدین حکمت یار کو کیا مشورہ دیا؟

عمران خان: گلبدین حکمت یار نے افغانستان کے انتخابات میں حصہ لیا اور وہ افغانستان کے آئین کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ڈیراسپیگل: یہ بات تسلیم کرنا بہت مشکل ہے؟

عمران خان: گلبدین حکمت یار سے بات چیت کرنے سے قبل میں نے افغانستان میں قومی مصالحت کی اعلیٰ کونسل کے سربراہ عبداللہ عبداللہ سے بات کی۔ افغانستان میں کوئی بھی ہمارا فیورٹ نہیں۔ ہمارا واحد مفاد اس بات میں ہے کہ اب افغانستان میں جو بھی حکومت تشکیل پائے وہ بھارت کو پاکستان کے خلاف افغان سرزمین استعمال نہ کرنے دے۔

ڈیراسپیگل: پاکستان پر الزام ہے کہ وہ کئی سال سے ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ (مقبوضہ) کشمیر میں عسکریت پسندوں کو استعمال کر رہا ہے اور دوسری طرف طالبان کے ذریعے بھارت کو افغانستان سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نوعیت کے الزامات پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

عمران خان: بدنصیبی کی بات ہے کہ پاکستان کا یہی امیج قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شروع ہوا یعنی ایران میں انقلاب کے برپا ہونے کے بعد۔ مغرب میں بہت سوں نے معاملات کو یوں دیکھنا شروع کیا کہ مسلم دنیا میں لبرل اور رجعت پسند تفریق ہے۔ یہ سراسر مصنوعی تجزیہ تھا۔ مسلم معاشرے باقی دنیا سے مختلف یا منفرد نہیں ہیں۔ دنیا بھر میں معاشرے اعتدال پسندوں کی اکثریت پر مشتمل ہیں۔ مسلم معاشروں کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔

ڈیراسپیگل: بہت جلد ایک ایسا قانون نافذ کیا جانے والا ہے، جس کے تحت فوج پر تنقید کرنا غیر قانونی قرار پائے گا۔ کیا اسے پاکستان میں اظہارِ رائے کی آزادی کا خاتمہ سمجھا جائے؟

عمران خان: کسی بھی مغربی ملک کے مقابلے میں پاکستان میں اظہارِ رائے کی آزادی زیادہ ہے۔ میں لفظ آزادی بہت احتیاط سے استعمال کر رہا ہوں کیونکہ میں نے برطانیہ میں تقریباً دو عشرے گزارے ہیں۔ وہاں کچھ بھی ایسا ویسا کہنے کی اجازت نہیں۔ وہاں ہتکِ عزت سے متعلق قوانین بہت سخت ہیں۔ میں نے ایک انگریز کرکٹ اسٹار کے خلاف ہتکِ عزت کا مقدمہ جیتا تھا۔ پاکستان میں اس نوعیت کے قوانین نافذ نہیں۔ وزیراعظم کی حیثیت سے مجھ پر بہت زیادہ ہتک آمیز انداز سے تنقید کی جاتی ہے۔ وزیراعظم کی حیثیت سے بھی میں انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔

ڈیراسپیگل: نیا قانون تو صرف قومی سلامتی کے اداروں کو کور کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ معاملہ سچائی کو بیان کرنے سے زیادہ اس بات کا ہے کہ فوج کس بات کو ہتک آمیز تصور کرتی ہے۔

عمران خان: تنقید صرف اس صورت میں برداشت کی جائے گی جب وہ صداقت اور حقائق پر مبنی ہو۔ ہماری سیکورٹی فورسز لڑائی میں روزانہ قیمتی جانیں کھو رہی ہیں۔ ہر

ملک اپنے اہم ترین اداروں کو تحفظ فراہم کرتا ہے، اس وقت نہیں جب وہ کچھ غلط کر رہے ہوں، بلکہ اس وقت جب انہیں کسی نہ کسی حوالے سے نشانہ بنایا جا رہا ہو۔

ڈیر اسپیگل: نیا قانون مستقبل میں صحافیوں کے لیے فوج سے متعلق کچھ بھی رپورٹ کرنا کم و بیش ناممکن بنا دے گا؟

عمران خان: سیکیورٹی فورسز کے معاملات سے نمٹنے کا دوسرا طریق کار ہوگا۔ میڈیا کے بجائے حکومتی سطح پر یہ معاملات نمٹائے جائیں گے۔ اگر میں کچھ غلط محسوس کروں گا تو آرمی چیف سے بات کروں گا۔ فوجی کارروائیوں میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں اور جب بھی ایسا کچھ ہوتا ہے، ہم بات کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ سرعام نہیں ہوسکتا۔ جب سپاہی اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہوں تب ان پر سرعام تنقید نہیں کی جاسکتی۔

ڈیر اسپیگل: مشرقِ وسطیٰ اس وقت غیر معمولی تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یمن، شام اور دیگر مقامات پر سعودی عرب اور ایران اپنے اپنے گروپس کے ذریعے ملوث ہیں۔ آپ نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان اختلافات کم کرانے سے متعلق ثالثی کی پیشکش کی ہے۔ اس حوالے آپ کچھ پیش رفت دیکھ رہے ہیں؟

عمران خان: جب میں نے اقتدار سنبھالا تھا تب یمن کے قضیے میں ثالثی کی پیشکش کی تھی۔ وہاں بہت بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بھی بہت بڑے پیمانے پر کی جارہی ہیں۔ میں نے اس حوالے سے ایران سے بھی بات کی اور سعودی عرب سے بھی۔ اگر کوئی بات چیت کے لیے آمادہ نہ ہو تو اسے دباؤ ڈال کر امن مذاکرات پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔

ڈیر اسپیگل: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ریاض اور تہران کبھی براہِ راست جنگ تک جائیں گے؟

عمران خان: ایسی کوئی بھی صورتِ حال انتہائی تباہ کن ثابت ہوگی۔ یہ کئی ممالک کے لیے بہت بڑا المیہ ثابت ہوگا، بالخصوص پس ماندہ ممالک کے لیے کیونکہ سعودی عرب اور ایران کی جنگ کی صورت میں تیل کے نرخ غیر معمولی حد تک بڑھ جائیں گے۔

ڈیر اسپیگل: متحدہ عرب امارات، بحرین اور سوڈان نے اسرائیل کو تسلیم کرکے باضابطہ سفارتی تعلقات قائم کرلیے ہیں۔ سعودی عرب بھی بظاہر تیاری کرچکا ہے۔ کیا اس کے بعد پاکستان کی باری ہے؟

عمران خان: ہر ملک خارجہ پالیسی کے حوالے سے اپنی ترجیحات رکھتا ہے۔ کسی بھی بڑے قومی فیصلے کے لیے عوام کی رائے بھی دیکھنا پڑتی ہے۔ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۹۴۰ء کے عشرے میں فلسطین کی صورتِ حال اور فلسطینیوں کے بنیادی حقوق کی بات کی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کا موقف آج بھی غیر متعلق نہیں اور ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ جب تک مسئلہ فلسطین منصفانہ طور پر حل نہیں کرلیا جاتا، ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کرسکتے۔

ڈیر اسپیگل: آپ نے چین میں ایک پارٹی کی حکومت پر مبنی نظام کو بارہا سراہا ہے اور پاکستان کے لیے اسے ایک اچھا معاشی ماڈل قرار دیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

عمران خان: جو کچھ چین نے حاصل کیا ہے وہ واقعی غیر معمولی ہے۔ میں چینی قیادت کو سراہتا ہوں کیونکہ انہوں نے کم و بیش ۷۰ کروڑ افراد کو افلاس کے دائرے سے نکالا ہے اور یہ سب کچھ محض ۴۰ سال میں ہوا ہے۔ میں پاکستان میں بھی ایسا ہی ماڈل چاہتا ہوں تاکہ لوگ افلاس سے نجات پائیں۔ انتخابی سیاست نہ ہونے کے باوجود چین کا نظام بہترین لوگوں کو اوپر لا رہا ہے، انہیں بہت کچھ کرنے کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ یہ نظام میرٹ کی قدر دانی پر مبنی ہے۔ جس میں صلاحیت ہوتی ہے اسے آگے آنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ کمیونسٹ پارٹی کس طور باصلاحیت افراد کو شناخت کرکے صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ مزید برآں، چین نے سات سال کے دوران وزیر کی سطح کے ۴۵۰ اعلیٰ افسران کو بدعنوانی میں ملوث ہونے کی بنیاد پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہے۔

ڈیر اسپیگل: اس سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

عمران خان: کوئی بھی ملک محض اس لیے افلاس زدہ نہیں ہوتا کہ اس کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ قیادت میں جب بدعنوانی پنپ چکی ہو تب ملک غربت کی چکی میں پستا ہے، ترقی نہیں کرپاتا۔ پانامہ پیپرز سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہمارے ملک پر بھی صادق آتی ہے۔ اس ملک سے کروڑوں ڈالر بدعنوانی کے ذریعے بٹور کر لندن جیسے شہروں کے مہنگے ترین علاقوں میں املاک خریدنے پر صرف کیے گئے۔

ڈیر اسپیگل: ان میں سے چند سیاست دان آپ کو اور آپ کی جماعت کو اقتدار سے دور کرنے کے لیے ایک ہوگئے ہیں۔ کیا آپ ان سے خوف محسوس کرتے ہیں؟

عمران خان: بالکل نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ یہ سب کچھ میرے لیے حیرت انگیز نہیں۔ وہ اپنے خلاف کرپشن کیسز کے خاتمے کے لیے مجھے بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔ میں کسی بھی طور ان کے دباؤ کے آگے نہیں جھکوں گا۔ ہمیں ملکی تاریخ میں سب سے بڑے تجارتی خلا یا خسارے کا سامنا ہے۔ ہماری درآمدات ۶۰ ارب ڈالر کی تھیں جبکہ برآمدات صرف ۲۰ ارب ڈالر کی۔ روپے کی قدر کو گراوٹ کا سامنا ہے۔ افراطِ زر میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ ہمیں ایندھن درآمد کرنا پڑتا ہے اور اس کے نرخ بڑھتے جارہے ہیں۔ بجلی سمیت ہر چیز مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں اپنی آمدنی بڑھانی ہے۔ اس کے لیے ٹیکس بیس بھی وسیع کیا جارہا ہے۔ ہم تکلیف دہ اصلاحات کے مرحلے سے گزر رہے ہیں اور ایسے میں اپوزیشن جماعتوں کے قائدین ایک ہوگئے ہیں۔ وہ اس لیے پریشان ہیں کہ اگر ہم نے معاشی معاملات کو درست کرلیا تو یہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے کیونکہ ان پر بڑے پیمانے کی بدعنوانی کے مقدمات چلائے جارہے ہیں۔

ڈیر اسپیگل: آپ نے حال ہی میں (تیسری) شادی کی ہے۔ بشریٰ بی بی روحانی شخصیت ہیں۔ آپ ان سے سیاسی معاملات پر مشاورت کرتے ہیں؟

عمران خان: کوئی بے وقوف ہی اپنی بیوی سے تمام معاملات پر بات نہیں کرتا۔ میری اہلیہ میں غیر معمولی ذہانت ہے۔ میں اپنی حکومت کو درپیش پیچیدہ صورتِ حال سمیت تمام اہم معاملات پر اہلیہ سے مشورہ کرتا ہوں۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ ان کے بغیر میں شاید بقا کے مسئلے سے دوچار ہوتا۔

"India is a Fascist State, Inspired by the Nazis". ("spiegel.de". Oct. 30, 2020)

●●●

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین وحضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضا کارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

جمال خاشقجی کا "بھوت"

David Hearst

دو برس قبل جمال خاشقجی نے اپنی ترک منگیتر سے شادی کے لیے کچھ کاغذات حاصل کرنے کے لیے استنبول کے سعودی قونصل خانے میں قدم رکھا، جہاں سے وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے۔ وہ وہاں صرف اپنی طلاق کی رسمی کارروائی پوری کرنے گئے تھے، ان کے قریبی دوستوں نے انہیں قونصل خانے جانے سے منع کیا تھا، پھر بھی جمال خاشقجی نے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ سعودی سفارت خانے میں کام کیسے ہوتا ہے۔ ترکی اور واشنگٹن میں ان کا مستقبل محفوظ تھا، مہینوں گومگو اور تنہائی میں رہنے کے بعد جمال نے اپنا ذہن بنا لیا، جب وہ لندن سے استنبول واپس آئے تو کسی بھی دوست سے رابطہ نہیں کیا بلکہ وہ سیدھے قونصل خانے گئے، جس کے بعد سات منٹ کے اندر ان کی موت ہو گئی۔ قرون وسطیٰ کے مظالم کی یاد تازہ کرتے ہوئے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ انہیں قتل کرنے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ اب اس مسئلے سے محمد بن سلمان کی جان کون چھڑائے گا۔ خاشقجی کے قتل نے محمد بن سلمان کی حیثیت کو ہی تبدیل کر دیا، جس کے بعد ولی عہد نے خود کو بہت مشکل صورت حال میں پایا۔ امریکا اور سعودی عرب کے درمیان تیل کی حفاظت کا سمجھوتہ ختم ہو چکا ہے۔ سعودیہ کے دو بڑے آئل ٹرمینلز پر حملہ کیا گیا، جس کو امریکی وزیر خارجہ مائیک پامپیو نے ایران کی جانب سے جنگی اقدام قرار دیا، لیکن پھر بھی امریکی صدر ٹرمپ معقول وجوہات کی بنا پر اس معاملے سے دور رہے۔ محمد بن سلمان کی وحشیانہ مہم نے یمن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے، سعودی عرب کا اہم اتحادی متحدہ عرب امارات بھی اس معاملے میں ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ وہ یمن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حوثیوں کو شمال میں محدود کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ ہفتوں قبل حوثیوں نے بڑے پیمانے پر حملہ کر کے سعودی اتحاد کے ۲ ہزار فوجیوں کو پکڑنے کا دعویٰ کیا، جس میں سعودی بھی شامل ہیں۔ ایران اس میدان جنگ سے بہت دور بیٹھا ہے، جبکہ سعودی ولی عہد نے اپنی سلطنت کے دل میں تباہی مچا دی ہے۔ ایران کے صدر حسن روحانی نے انکشاف کیا کہ انہیں عراقی وزیر اعظم عادل عبدالمہدی کے ذریعے سعودی عرب کا خط موصول ہوا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس خط میں کیا لکھا گیا، لیکن یہ تو واضح ہے کہ خط میں اعلانِ جنگ نہیں کیا گیا۔ ایک سال کے بعد ولی عہد ہر محاذ سے پسپائی اختیار کر رہے ہیں، لیکن محمد بن سلمان اب بھی گھر میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں۔ دینی اسکالر سلمان العودہ (Salman al-Odah) پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے، جس میں انہیں سزائے موت بھی دی جا سکتی ہے۔ محمد بن سلمان میں مغرب کے لیے کشش ختم ہو چکی ہے، انہیں اب انتہائی امیر اور ماڈرن شہزادے کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، نوجوان ولی عہد بہت جلدی میں ہیں، نیویارک ٹائمز کے کالم نگار تھامس فریڈ مین جیسے لکھاریوں نے انہیں بہترین مصلح قرار دیا تھا۔ امریکا میں ان کا نام بدنام ہو چکا ہے، کوئی بھی کھلے عام ولی عہد کی حمایت نہیں کرتا، اب ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے لوگوں کی قطاریں نہیں لگیں، اب کوئی اڑنے والی ٹیکسی، روبوٹ اور صحرا میں نئے شہروں کی تعمیر کی بات نہیں کرتا، ان سب ناکامیوں کے لیے خاشقجی براہ راست ذمہ دار ہیں۔ ویسے قابل ذکر بات یہ ہے کہ خاشقجی نے محمد بن سلمان کے اصلاحی ایجنڈے کی حمایت کی تھی، انہوں نے سعودی عرب میں ہونے والی تبدیلیوں کو تسلیم کیا تھا، بس تنقید اس بات پر تھی کہ اصلاحاتی عمل کس طرح آگے بڑھانا ہے۔

بدقسمتی سے ولی عہد کے ذاتی محافظوں کی نگرانی میں خاموشی سے خاشقجی کو قتل کر دیا گیا، لیکن تاریخ نے اس واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ محفوظ کر لیا ہے۔ سعودی عرب نے قتل کے شواہد کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے ترک انٹیلی جنس کے سربراہ کو ریاض آنے کی دعوت دی اور دعویٰ کیا کہ اس پورے معاملے کو ایک بیٹھک میں نمٹایا جا سکتا ہے، ترکی نے پیشکش مسترد کر دی۔ انہوں نے ترکی کے صدر رجب طیب اردوان کو رشوت دینے کی پیش کش کی، اس میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے فرانزک ثبوت کو ختم کر دیا، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سی آئی اے نے اپنے ٹیلیفون ریکارڈ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ محمد بن سلمان نے ہی خاشقجی کے قتل کا حکم دیا تھا۔ سعودی ولی عہد نے خاشقجی کے قتل کا حکم اس لیے دیا تھا کہ کیوں کہ وہ ہر مخالف آواز کو خاموش کرانا چاہتے ہیں۔ خاشقجی اس سعودی حکومت کا حصہ رہ چکے ہیں۔ روسی صدر پوتن نے برطانیہ میں اپنے ایک مخالف کو زہر دے دیا تھا، محمد بن سلمان بھی روسی صدر کے مداح نکلے اور ان کا طریقہ اختیار کیا، وہ چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سعودی ان کی دسترس سے باہر نہ نکل سکے۔ یوں لگتا ہے کہ خاشقجی ولی عہد کی ذاتی جاگیر کی طرح تھے اور ایک حکمران کو پورا حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے، اس کو ہی تو مطلق حکمرانی کہتے ہیں۔ خاشقجی کے قتل کا خلاف توقع اثر ہوا، اکتوبر کے اس دن کے بعد سے ہی محمد بن سلمان قتل کے اثرات سے نہیں نکل سکے، حتیٰ کہ سی آئی اے کی ڈائریکٹر جینا ہاسپل اور واشنگٹن نے ولی عہد کے خلاف جانے کا فیصلہ کر لیا، جس کے بعد سے ولی عہد کی مشکلات ختم ہونے کو نہیں آ رہی ہیں۔ انہوں نے قتل کے اثرات سے نمٹنے کے لیے ایک ہنگامی کمیٹی تشکیل دی، جس نے انتہائی عجیب مشورے دیے، جس میں سے ایک ولی عہد اور اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کے درمیان کیمپ ڈیوڈ میں ملاقات تھا، جس سے خطے کی پوری سیاست بدل کر رہ جائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہو پایا۔ پھر ولی عہد نے امریکا کے مقابلے کے لیے چین سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی، اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، جب بھی محمد بن سلمان نے یہ سوچا کہ خاشقجی کے بھوت سے جان چھوٹ گئی ہے، وہ ان کو ڈھونڈتا ہوا ان کے گھر تک پہنچ گیا۔

مملکت کے اندر بھی کچھ نہیں بدلا جا سکتا، مخالفین اور کاروباری حریفوں کو بدترین حالات میں سعودی جیلوں میں بند کر دیا گیا، ظلم اور جبر اب بھی پہلے کی طرح روا ہے، محمد بن سلمان نے اپنی ناکامیوں کے تسلسل سے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے۔ خاشقجی کے قتل نے سعودی حزب اختلاف کو وہ کردار دیا، جس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ امید کی ایک نئی لہر اٹھی ہے، کیوں کہ ان کی موت کے اثرات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے، عرب دنیا کو ایک نئی امید ملی ہے، جو ایک جرم سے بہت بڑھ کر ہے، ایسا جرم جس کی کوئی سزا ابھی نہیں دی جائے گی۔

خاشقجی نے عرب دنیا کو امید کا پیغام دیا ہے، اگر ان کی زندگی کو ایک پیغام قرار دیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ''سعودی عرب میں جمود برقرار نہیں رہ سکتا''، بہت جلد تبدیلی کی لہر اٹھنے والی ہے، جو سب تباہ کر دے گی۔ ۲۰۱۳ء میں مصر میں بہار عرب کی تبدیلیوں کو کچل دینے کے بعد چھا جانے والی مایوسی اب ختم ہو چکی ہے۔ مصر کے صدر عبدالفتاح السیسی کو مستعفی ہونے کا مطالبہ کرتے سڑک پر آنے والے مظاہرین

باقی صفحہ نمبر ۴

نئی امریکی انتظامیہ اور ترجیحات

افتخار گیلانی

۲۰۱۶ء میں جس وقت ڈونالڈ ٹرمپ ریپبلکن پارٹی کی طرف سے صدارتی نامزدگی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، بھارتی اپوزیشن کانگریس کی صدر سونیا گاندھی علاج کے سلسلے میں امریکا میں تھیں۔ واپسی پر جب وہ پارلیمان کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے آئیں، تو وقفہ کے دوران مرکزی ہال میں کئی صحافی اور سیاستدان ان کی خیر و خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کے اردگرد جمع تھے۔ مختلف موضوعات کے علاوہ امریکی سیاست بھی زیر بحث تھی۔ چونکہ وہ امریکا سے تازہ وارد ہوئی تھیں، اکثر افراد ان سے متوقع امیدواروں، اور ان کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے کہا کہ بزنس مین ڈونالڈ ٹرمپ کے نہ صرف ریپبلکن پارٹی کی نمائندگی حاصل کرنے کے قوی امکانات ہیں، بلکہ وہ امریکا کے آئندہ صدر بھی ہو سکتے ہیں۔ محفل میں بس ایک قہقہہ بلند ہوا۔ کسی نے لقمہ دیا کہ ٹرمپ کے عہدہ سنبھالنے کی صورت میں نظریات اور کام کرنے کے طریقہ کے پیش نظر اس کی وزیر اعظم مودی کے ساتھ اچھی جوڑی جمے گی۔ واقعی اگلے چار سال کے عرصے میں ہیوسٹن میں 'ہاؤڈی مودی' اور پھر اس سال فروری میں احمد آباد میں 'نمستے ٹرمپ' جیسی پبلک تقریبات کا انعقاد کرکے، دونوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ سفارتی آداب و تعلقات کو کسی بھی حد تک ذاتی تشہیر کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ستمبر ۲۰۱۸ء میں جب دہلی میں بھارت اور امریکا کے وزرائے خارجہ و دفاع کے اجلاس کے بعد مشترکہ پریس کانفرنس ہو رہی تھی، تو میرے سمیت کئی صحافی امریکی وزیر دفاع جم میٹس کی توجہ مبذول کرکے سوال کرنے کی کوشش کر رہے تھے، کہ اسی دوران پیچھے سے ان کے وفد میں شامل ایک امریکی صحافی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ سوال پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، میٹس اس عہدہ پر بس چند دن کے مہمان ہیں۔ شاید اسی شام جب امریکی وفد ابھی دہلی کے ایئرپورٹ پر جہاز میں سوار ہو رہا تھا کہ صدر ٹرمپ نے شام سے امریکی فوجوں کے انخلا کی مخالفت کرنے پر جم میٹس کے خلاف ٹویٹ داغا اور چند دن بعد ان سے استعفیٰ لے لیا۔ اپنے چار سالہ دور حکومت میں میٹس، وزیر خارجہ ریکس ٹیلرسن، تین قومی سلامتی مشیروں مائیکل فلن، ایچ آر میک ماسٹر اور جان بولٹن کے علاوہ ٹرمپ نے ۵۰۳ افسران کو معطل کرکے یا ان کو دیگر کم رتبہ والے عہدوں پر ٹرانسفر کرکے بتا دیا کہ وہ ہی حرف آخر ہیں۔ وائٹ ہاؤس کے اپنے پہلے چیف آف اسٹاف رینی پریبس کو تو انہوں نے چند ماہ میں ہی فارغ کر دیا۔ دفتری روایت و قواعد و ضوابط کے مطابق چیف آف اسٹاف کے ذریعے ہی امریکی صدر سے ملاقات اور اوول آفس تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ وائٹ ہاؤس کی انتظامیہ کا سربراہ ہونے کے ناطے وہ صدارتی مصروفیات کا نہ صرف نگران ہوتا ہے بلکہ ملاقاتوں کے لیے اور فائلیں صدر کو پیش کرنے سے قبل ان کو پڑھ کر بریف بھی تیار رکھتا ہے۔ ایک بار جب ہوم لینڈ سیکرٹری ٹام بوسرٹ بغیر کسی اپوائنٹ منٹ کے اوول آفس میں صدر ٹرمپ سے ملاقات کر رہے تھے، تو پریبس نے کمرے میں داخل ہو کر، بوسرٹ کو خوب برا بھلا کہا اور ان کو قواعد و ضوابط یاد دلائے۔ شاید ان کو ٹرمپ کے کام کرنے کے غیر روایتی طریقہ کا اندازہ نہیں تھا، یا وہ نئے صدر کو دفتری ضوابط میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اگلے ہی دن اس پاداش میں ان کو برخاست کر دیا گیا۔

جون ۲۰۱۹ء کو جب امریکی فضائیہ کے طیارے ایران کے تین ٹھکانوں پر بمباری کے لیے قطر، افغانستان اور خلیج فارس کے فوجی اڈوں سے پرواز کرنے والے تھے، اور وائٹ ہاؤس کے آپریشن روم میں اسکرین کے سامنے ٹرمپ اپنے معاونین کے ساتھ بیٹھ گئے تھے، کہ انہوں نے سی آئی اے کے سربراہ جان برنان سے پوچھا کہ اس حملے میں کتنے افراد کی ہلاکت کا اندیشہ ہے؟ جب اس نے کہا کہ تقریباً ڈیڑھ سے دو سو کے قریب افراد ہلاک ہو سکتے ہیں، تو آپریشن سے دس منٹ پہلے ٹرمپ نے اس آپریشن کو رد کرنے اور صرف ایرانی کمانڈو دستے کے سربراہ جنرل قاسم سلیمانی کا ہی تعاقب کرنے اور ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ کئی جہاز تو فضا میں بلند ہو چکے تھے، کہ ان کو اپنے مستقر واپس آنے کے لیے کہا گیا۔ ٹرمپ کے دور حکومت کی خاص بات یہ تھی کہ پوری طاقت وائٹ ہاؤس میں ہی مرکوز ہو گئی تھی۔ کسی بھی امریکی افسر میں یہ طاقت نہیں رہ گئی تھی، کہ وہ اپنے بل بوتے پر کوئی فیصلہ کر سکے۔ اس دوران تو اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ، سی آئی اے، پینٹاگون و دیگر ادارے ایک طرح سے عضو معطل بن کر رہ گئے تھے۔ دنیا کے حکمران بھی جان گئے تھے کہ اپنے ملکوں میں امریکی سفیروں کی ناز برداری کرنے کے بجائے بس صدر ٹرمپ کے داماد جیرڈ کوشنر کو شیشے میں اتار کر ٹرمپ تک براہ راست رسائی حاصل کرکے ہی کام نکالے جا سکتے ہیں۔ کسی حد تک ٹرمپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کے خلاف امریکی میڈیا سمیت کئی طاقتوں نے مجتمع ہو کر مہم چلائی اور ان کی ناکامی میں کردار ادا کیا۔ ان کا واضح اشارہ امریکی اسٹیبلشمنٹ کی طرف ہے، جو ان کے دور میں مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ مگر اس قدر سخت مخالفت کے باوجود ٹرمپ نے ۷۰ ملین ووٹ لے کر یہ ثابت کر دیا کہ امریکی سوسائٹی کس قدر بٹ چکی ہے اور ان ورکنگ کلاس میں ان کی اپیل خاصی پر اثر ہے، جس کے امریکی سیاست اور سماج میں خاصے دور رس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ افغانستان، فلسطین، عرب۔ اسرائیل تعلقات کے حوالے سے جو بائیڈن کی انتظامیہ ٹرمپ کی پالیسیوں کو برقرار رکھے گی، مگر حقوق انسانی کے حوالے سے امریکا سے اب کچھ زیادہ چیخ و پکار سنائی دی جائے گی۔ اسرائیل کی طرف سے فلسطینی علاقوں کو ضم کرنے کے اقدامات پر امریکی حکومت کی پالیسی تبدیل ہو سکتی ہے۔ ابھی فی الحال بائیڈن کی ٹیم کی ترجیحات میں چین یعنی ایشیا پیسیفک، ماحولیات اور کورونا وائرس سے نمٹنا شامل ہوگا۔ بائیڈن انتظامیہ میں امریکی اسٹیبلشمنٹ وڈیپ اسٹیٹ اب دوبارہ اپنے رنگ میں نظر آئے گی۔ چونکہ بائیڈن کی عمر کے پیش نظر ان کی صحت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں رہتی ہے، اس لیے نائب صدر کملا ہیرس اپنے پیش روؤں کے برعکس خاصی فعال نظر آئیں گی۔ ان کے والد ڈونالڈ ہیرس ویسٹ انڈیز کے ملک جمیکا سے امریکا آئے تھے، جبکہ والدہ شیاملہ گوپالن بھارت کے شہر چنائی سے امریکا وارد ہوئی تھیں۔ چونکہ انہوں نے کشمیر کی آئینی حیثیت کو تبدیل کرنے پر وزیر اعظم نریندر مودی کو آڑے ہاتھوں لیا تھا، اس لیے امید ہے کہ کم از کم اس معاملے میں وہ بھارتی حکومت پر دباؤ بنائے رکھیں گی۔ گزشتہ برس اگست کے اقدامات کے بعد جب بھارت نے کشمیر میں سخت پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں تو کملا ہیرس نے کہا تھا کہ ''ہمیں کشمیریوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ وہ اپنی اس جدوجہد میں تنہا نہیں ہیں''۔ انہوں نے مزید کہا تھا کہ ''ہم حالات کا مسلسل جائزہ لے رہے ہیں اور اگر حالات کا تقاضا ہوا تو ہمیں مداخلت کرنے کی ضرورت ہوگی''۔ ایک موقع پر انھوں نے بھارتی وزیر خارجہ جے شنکر پر بھی براہ راست سخت تنقید کی۔ امریکی کانگریس کی ایک اور بھارتی نژاد رکن پرامیلا جے پال نے جب کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف

ورزیوں کے بارے میں امریکی ایوانِ نمائندگان میں ایک قرارداد پیش کی تھی، تو جے ٹنکر، جو اس وقت امریکا میں ہی تھے، نے امریکی کانگریس کی عمارت میں خارجہ امور کی کمیٹی کے کشمیر پر ہونے والے اس اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس میں جے پال موجود ہوں گی۔ کملا ہیرس نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ کسی بھی غیر ملکی حکومت کو کانگریس کو یہ بتانے کا حق نہیں ملتا ہے کہ اجلاس میں کون سے ارکان شریک ہو سکتے ہیں۔ کملا ہیرس بھارت کے متنازع شہریت قانون پر بھی تنقید کرتی رہی ہیں۔ اس قانون کی وجہ سے بھارت میں مسلمانوں سے امتیازی سلوک کیے جانے کے امکانات کے الزامات لگ رہے ہیں۔ گو کہ چین کے ساتھ نمٹنے کے لیے امریکا کو بھارت کی ضرورت پڑے گی، مگر اگر حقوق انسانی کے حوالے سے امریکا بیجنگ پر انگشت نمائی کرتا ہے تو بھارت کو بھی اسی پلڑے میں رکھنا پڑے گا۔ فی الحال بھارتی حکومت بائیڈن کے حالیہ بیانات سے سخت خائف تو ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ ڈیموکریٹک حکومتوں کا رویہ بھارت کے تئیں خاصا نرم رہا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں پہلے جوہری دھماکوں کے بعد جب امریکی کانگریس میں بھارت پر اقتصادی پابندیاں لگانے کی قرارداد پیش ہوئی تو بس ایک ووٹ سے مسترد ہوئی۔ وہ ایک ووٹ، جس نے بھارت کو پابندیوں سے بچایا، نئے سینیٹر بائیڈن کا تھا۔ اسی طرح ۲۰۰۵ء میں صدر جارج بش اور وزیراعظم من موہن سنگھ نے جوہری معاہدہ پر دستخط تو کیے، مگر جوہری تکنیک کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھارت کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے کی امریکی کانگریس میں ڈیموکریٹس نے خاصی مخالفت کی۔ اس وقت پھر بائیڈن نے ہی اپنی پارٹی کے اراکین پارلیمان کو منوا کر ۲۰۰۸ء میں بھارت کو چھوٹ دلوانے کا قانون پاس کروالیا۔ بھارت اس وقت ناٹو پلس پانچ کے اتحاد میں چھٹے ملک کی حیثیت سے شرکت کا خواہاں ہے۔ اس اتحاد میں ناٹو ممبران کے علاوہ اسرائیل، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان شامل ہیں۔ یعنی کوارڈ کے بعد بھارت امریکا کی قیادت میں ایک اور اتحاد کی ممبر شپ کا خواستگار ہے۔ امید ہے کہ اگر امریکا بھارت کو اس اتحاد میں شامل کرواتا ہے، یا کچھ رعایات دلواتا ہے، تو بائیڈن انتظامیہ کے لیے لازم ہے کہ اس کے بدلے مودی حکومت کو اقلیتوں کے تئیں اپنے رویے میں تبدیلی کرنے اور کشمیر کے حوالے سے کسی مثبت پیش رفت کرنے پر مجبور کرے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۰ر نومبر ۲۰۲۰ء)

●●●

بھارتی مسلمان ووٹر: متبادل حکمت عملی کی ضرورت

افتخار گیلانی

امریکی ووٹروں نے صدارتی انتخابات میں کورونا وائرس سے نمٹنے میں ناکامی، ابتر معیشت اور سیاہ فاموں کے خلاف نسلی تشدد کے لیے صدر ڈونالڈ ٹرمپ کو وائٹ ہاوس سے باہر کا راستہ تو دکھا دیا، مگر ہزاروں میل دور بھارت کی مشرقی ریاست بہار کے حالیہ انتخابات میں جس طرح وزیراعظم نریندر مودی کی پارٹی بی جے پی کے زیر قیادت اتحاد نے اقتدار میں واپسی کی، اس سے لگتا ہے کہ دہلی میں ہوئے مسلم کش فسادات، کورونا وائرس سے نپٹنے میں ناکامی یا لاک ڈاؤن کی وجہ سے مہاجر مزدوروں کی حالت زار بھارتی ووٹروں کو پسیج نہیں پائی۔ تمام تر ناکامیوں کے باوجود، وہ مودی کی گفتار اور ہندوتوا کی سیاست کے اسیر ہیں۔ مگر باریک بینی سے انتخابات کے نتائج کا تجزیہ کرنے سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ مودی کے رتھ کو روکنے میں ناکامی کی ذمہ داری اپوزیشن کانگریس کے سر جاتی ہے، جس کی من مانی اور زیادہ سے زیادہ سیٹیں لڑنے کی ضد نے سیکولر اتحاد کی کامیابی میں روڑے اٹکائے۔ اب اس کے رہنما مع چند بندھوا مسلم رہنماؤں و علما سیکولر اتحاد کی ہار کا پورا ٹھیکرا حیدرآباد کے ممبر پارلیمان اسدالدین اویسی کے سر پر پھوڑ کر یہ بتانا چاہ رہے ہیں، کہ ان کی وجہ سے مسلم ووٹ بکھر گیا اور ہندو ووٹ یکجا ہو گیا۔ اویسی کی آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین (ایم آئی ایم) دلتوں کی بہوجن سماج پارٹی اور سماج وادی جنتا دل کے ساتھ مل کر ۲۰ نشستوں پر قسمت آزمائی کر رہی تھی اور پانچ نشستیں جیتنے میں کامیاب ہو گئی۔ کانگریس نے پچھلی بار کل ۴۳ نشستوں میں سے ۴۰ نشستوں پر انتخاب لڑا اور ۲۰ جیت گئی تھی۔ اس بار اس نے ۷۰ سیٹوں پر لڑنے کی ضد کی، مگر بس ۱۹ میں کامیابی حاصل کی۔ اگر یہ سیٹیں بائیں بازو یا راشٹریہ جنتا دل کے کھاتے میں چلی جاتی، تو نتائج کچھ مختلف ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ کانگریس پارٹی کے صدر کے عہدے پر فائز ہونے کے ایک ماہ بعد دہلی کے سری فورٹ آڈیٹوریم میں سونیا گاندھی کی تقرری پر مہر لگانے کے لیے اپریل ۱۹۹۸ء میں کانگریس کمیٹی کا سیشن منعقد ہوا۔ لوک سبھا میں پارٹی کے رہنما شرد پوار نے میٹنگ میں یاد دلانے کی کوشش کی کہ اب یہ عہد رفتہ کی کانگریس نہیں ہے۔ انہوں نے کانگریس کی تشبیہ کسی زمیندار سے دی، جس کی زمینیں بک چکی ہیں، حویلی خستہ حال ہو چکی ہے۔ وہ خود مقروض ہو کر زندگی کھینچ تو رہا ہے، مگر زمینداری کا نشہ برقرار ہے۔ ملک بھر سے آئے کانگریس کے اراکین کو یہ تشبیہ سخت ناگوار گزری اور انہوں نے پوار کی اس قدر ہونک کی کہ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی تقریر ختم کی۔ اس سیشن میں جو سیاسی قرارداد پاس ہوئی، اس کا لب لباب تھا کہ گاندھی فیملی نے اب چونکہ دوبارہ کانگریس کی قیادت سنبھالی ہے، اس لیے اب پارٹی عروج کی طرح گامزن ہو جائے گی اور اپنے دم پر اتحادیوں کے بغیر انتخابات لڑے گی۔ مگر متواتر انتخابات ہارنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ ہرکشن سنگھ سرجیت کی ایما پر ۲۰۰۴ء کے انتخابات میں کانگریس نے سیٹوں کی تقسیم میں دریا دلی دکھا کر متحدہ ترقی پسند اتحاد تشکیل دے کر دیگر پارٹیوں کی مدد سے بی جے پی کی زیر قیادت اٹل بہاری واجپائی حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ مگر جلد ہی انا عود کر آ گئی۔ چند برسوں کے بعد جب ۲۰۰۹ء کے پارلیمانی انتخاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں، تو بہار کی سب سے بڑی پارٹی لالو پرساد یادو کی راشٹریہ جنتا دل (آر جے ڈی) نے کانگریس کو ۴۰ میں سے پانچ نشستیں لڑنے کی پیشکش کی۔ مگر کانگریس نے اس کو حقارت سے ٹھکرا کر اعلان کیا کہ وہ سبھی نشستوں پر امیدوار کھڑا کرے گی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس خود کوئی سیٹ لینے میں کامیاب تو نہیں ہوئی، دوسری طرف ووٹوں کی تقسیم کی وجہ سے آر جے ڈی بس چار سیٹیں جیت پائی۔ پارٹی اسٹرکچر کو مضبوط بنانے کے بجائے کانگریس ابھی بھی گاندھی فیملی کو ہی انتخابات میں بھنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے رہنما ابھی تک اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ موجودہ دور کا عام ووٹر پریوں اور راجے مہاراجوں کی کہانیاں سن کر پروان نہیں چڑھا ہے۔ بلکہ وہ اب اسی رہنما کو ترجیح دیتا ہے جو قابلِ رسائی ہو یا ماضی میں اس کی ہی جیسی زندگی گزار چکا ہو۔ کانگریس اب ایسا بوجھ بن گئی ہے کہ جسے کوئی اتحادی اب شاید ہی اپنے ساتھ رکھنا چاہے گا۔ پڑوسی ریاست اتر پردیش میں تو سونیا گاندھی کی صاحبزادی پریینکا گاندھی نے ضمنی انتخابات میں کمان سنبھالی تھی، مگر پھر بھی امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ ان انتخابات میں ایک بار پھر یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ آخر بھارت میں بسنے والے ۲۰۰ ملین مسلمان کیا کریں؟ سیکولر پارٹیوں کا حال

یہ ہے کہ پچھلے سال ماہ رمضان سے دو ماہ قبل اتر پردیش کی سماج وادی پارٹی کے سربراہ نے ضلعی صدور کو پیغام بھیجا تھا کہ تزک و احتشام کے ساتھ افطار پارٹیوں کا اہتمام نہ کیا جائے۔ اگر ذاتی طور پر کوئی مقامی رہنما افطار کا اہتمام کرتا ہے تو وہاں ملائم سنگھ یا دویا ان کے صاحبزادے اکھلیش سنگھ کی تصویر یا پارٹی کا بینر آویزاں نہیں ہونا چاہیے۔ مزید ہدایت تھی کہ اگر کسی کی افطار پارٹی میں جانا ہو اتو وہاں ٹوپی لگا کر سلفی یا تصویریں نہ کھنچیں یا کم از کم ان کو سوشل میڈیا کی زینت نہ بنائیں۔ اس پارٹی کے ایک مقتدر مسلم رہنما اعظم خان فی الوقت اپنے اہل و عیال کے ساتھ جیل میں بند ہیں۔ ان کی رہائی کے لیے سماج وادی پارٹی کے کسی رہنما نے کوئی مہم چلانا تو دور کی بات، زبانی جمع وخرچ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ چند برس قبل کانگریس کے مقتدر رہنما اور ایوان بالا میں قائد حزب اختلاف غلام نبی آزاد کو شکوہ کرنا پڑا کہ ان کی پارٹی کے ہندو اراکین اب ان کو اپنے حلقوں میں جلسے اور جلوسوں میں مدعو کرنے سے کتراتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا ۱۹۷۳ء میں کانگریس میں شمولیت کے بعد سے لے کر آج تک انہوں نے ہر انتخابی مہم میں شرکت کی ہے اور ہندو رہنما ان کو اپنے انتخابی حلقوں میں لے جانے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ پہلے جہاں جلسے جلوسوں میں ان کو مدعو کرنے کے لیے ۹۵ فیصد درخواستیں ہندو رہنماؤں کی آتی تھیں، اب پچھلے چار سالوں میں سکڑ کر محض ۲۰ فیصد رہ گئی ہیں۔

۲۰۱۷ء میں گجرات کی صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر کانگریس نے کارکنوں کو باضابطہ ہدایت دی تھی کہ اسٹیج پر کوئی مسلم رہنما براجمان نہ ہو۔ حتیٰ کہ گجرات سے کانگریس کے مقتدر رہنما اور سونیا گاندھی کے سیاسی مشیر احمد پٹیل کو پس پردہ رہنا پڑا۔ امیدواروں کو بتایا گیا تھا کہ وہ مسلم محلوں میں ووٹ مانگنے نہ جائیں اور جلسے، جلوسوں میں لمبی داڑھی وٹوپی والوں کو اگلی صفوں میں نہ بٹھائیں۔ اسی طرح کی حکمت عملی بعد میں ۲۰۱۹ء کے عام انتخابات میں بھی اپنائی گئی۔ ہندو ووٹروں کو لبھانے کے لیے راہول گاندھی نے مندروں اور مٹھوں میں جا کر آشیرواد بھی لی تاکہ خود کو مودی سے زیادہ ہندو ثابت کر سکیں۔

پارٹی نے مسلم رہنماؤں کو یہ بھی بتایا تھا کہ انتخابات میں وہ ٹکٹ یا مینڈیٹ کے حصول کے لیے تگ و دو نہ کریں اور حلقہ کے لیے کسی مضبوط سیکولر ہندو امیدوار کر ترجیح دے کر اس کو کامیاب بنائیں۔ انتخابات کے دوران اتر پردیش کا دورہ کرتے ہوئے دیوبند شہر میں معروف وکیل ندیم اختر نے راقم کو بتایا تھا کہ بی جے پی کو پتا ہے کہ مسلمان ان کے امیدوار کو ووٹ نہیں دیتا ہے، اس لیے ان کا امیدوار ووٹ مانگنے ہی نہیں آتا ہے۔ اس کے رہنماؤں کی کوشش ہوتی ہے کہ مسلم ووٹ تقسیم اور ہندو ووٹ یکجا ہو۔ ادھر سیکولر پارٹیوں کو معلوم ہے کہ مسلمان کہاں جائے گا، ووٹ تو بہر حال انہی کو ملنا ہے، اس لیے وہ بھی ان کے سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل نہیں کرتے ہیں۔ اتر پردیش کے ہی کوسی کلان قصبہ میں مسلمان محلوں کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی، کہ چند لمحے وہاں گزارنا محال تھا۔ ٹوٹی سڑکوں اور گندے نالے کے کنارے واقع اس محلے میں بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ کیا بلدیہ اس علاقے میں صفائی نہیں کرواتی ہے، تو لوگوں کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں پچھلے کئی سالوں سے بی جے پی کا کونسلر انتخاب جیت رہا ہے، اس لیے اس علاقے میں خاکروب وغیرہ آتے ہی نہیں ہیں۔ بریلی کے مسلم اکثریتی علاقہ شامت گنج کی تقریباً چار لاکھ آبادی کے لیے صرف ایک بینک اور چار اے ٹی ایم تھے۔ یہ علاقہ زردوزی کے لیے مشہور ہے۔ علی گڑھ کے جو علاقے تالے بنانے کے گڑھ سمجھے جاتے ہیں مگر ان میں کوئی بینک نہ پوسٹ آفس تھے۔ البتہ ان دونوں علاقوں میں تین چار پولیس اسٹیشن اور کئی درجن پولیس پوسٹیں قائم تھے۔ کئی برس قبل تک میں بی جے پی کے مسلم رہنماؤں جیسے شاہنواز حسین اور علما میں مولانا وحید الدین خان کی اس دلیل کا کسی حد تک قائل ہو گیا تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کو منفی ووٹ دینے کے بجائے بی جے پی اور دائیں بازو کی دیگر جماعتوں میں بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہیے، تاکہ ان کی موجودگی سے ان پارٹیوں کا رویہ مسلمانوں کے تئیں نرم ہو اور سیکولر پارٹیاں بھی ان کو بس ترنوالہ نہ سمجھیں۔ مگر اس میں اب سب سے بڑی رکاوٹ بی جے پی خود ہے جس نے شدت پسند ہندو نظریات کو اپنا محور بنایا ہوا ہے اور اس میں اقلیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ ۲۰۱۴ء میں کئی کشمیری مسلمانوں نے بی جے پی میں شمولیت کی تھی۔ ان میں حنا بھٹ اور شیخ خالد جہانگیر بی جے پی کا خوف دور کرنے کے لیے وعدے کر رہے تھے کہ پارٹی کشمیر کے خصوصی تشخص اور اختیارات سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کریگی۔ حنا بھٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا، کہ اگر ایسی کوئی کوشش ہوتی ہے، تو آگے آکر پہلے اس کی مخالفت کرے گی۔ پتا نہیں وہ اب اپنے اس ویڈیو کو دوبارہ دیکھتی ہیں کہ نہیں اور کس طرح یہ رہنما اپنے ضمیر کو کچل کر بی جے پی کے ایجنڈے کے حصہ بن کر اپنے ہم وطنوں کا قافیہ تنگ کر رہے ہیں؟

کشمیر کے بعد تو اب آسام میں بھی مسلم اکثریتی علاقوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ بی جے پی کی پچھلی اوتار یعنی بھارتیہ جن سنگھ، بھارتی سیاست میں ۵۰ کی دہائی سے لے کر ۸۰ تک دائیں بازو کی اہم جماعت تھی۔ مگر اس کے اعلیٰ عہدوں پر کئی مسلمان بھی براجمان تھے۔ اندرا گاندھی کے خلاف ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مسلمانوں اور دہلی کی شاہی جامع مسجد کے امام سید عبداللہ بخاری نے جن سنگھ کے امیدواروں کے حق میں مہم چلا کر جتوا بھی دیا تھا۔ مگر بی جے پی جس طرح اب ہندو شدت پسندی کو گلے لگا کر مسلمانوں کو معتوب و مغضوب بنا کر ووٹ بٹور رہی ہے، اس کے مدنظر کسی باضمیر مسلمان کا بی جے پی کو ووٹ دینا یا اس کی صفوں میں شامل ہونا ناممکن ہے۔ حکومت گجرات کے ایک سابق افسر ہرش مندر کے مطابق مسلمانوں کے لیے اتنا برا وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کی تقسیم کے موقع پر بھی نہیں۔ گو کہ دنیا میں مسلمانوں کی جو آبادی ہے اس کا دسواں حصہ بھارت میں ہے، مگر اس کے باوجود وہ سیاسی یتیم بنائے گئے ہیں۔ ان میں اب تعلیم و ترقی کے بجائے سلامتی کا احساس زیادہ ہے جو ایک خطرناک علامت ہے۔ اب یہ اہم سوال مسلمانوں کے سامنے ہے کہ کیا وہ سیکولر پارٹیوں کا دامن تھامے رکھیں، جنہیں ان کی تعلیم و ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں اور جو ان کو صرف ووٹ بینک کی نظر سے دیکھتے ہیں یا جنوبی صوبہ کیرالا کا ماڈل اپنا لیں؟ کیرالا میں مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعت ہے اور چونکہ اس صوبہ میں مخلوط حکومت ہی اقتدار میں آتی ہے، اس لیے یہ حکومت میں شریک بھی رہتی ہے۔ سیاسی نمائندگی کی وجہ سے اس صوبہ میں مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی صورت حال خاصی بہتر ہے۔ مبصرین کے مطابق شمالی بھارت یا کسی دوسرے صوبے میں ایسی سیاسی جماعت بنانا ناممکن ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ہندو خوف کی نفسیات میں مبتلا ہو کر فرقہ پرست جماعتوں کا دامن تھام کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔

معروف مصنفہ اروندھتی رائے نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ بھارت میں ''مظلوموں کا اتحاد'' قائم کرنے کے وافر مواقع ہے کیونکہ مسلمانوں کی طرح دلت اور قبائلی بھی موجودہ نظام کا شکار ہیں۔ اس طرح کا ہی کوئی اتحاد بھارت میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اویسی اس راہ پر گامزن ہیں۔ مہاراشٹرا میں بھی انہوں نے دلت پارٹیوں کے ساتھ ہاتھ ملا کر انتخابات میں شرکت کی تھی۔ مگر سیکولر پارٹیوں نیز چند علما ان کے خلاف ایسی تیر اندازی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ان کے عقائد پر

باقی صفحہ نمبر ۱۴

ترقی پسندی

منصف مرزوقی

گزشتہ صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں عرب اور یوروپی ممالک کی جامعات میں انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا تھا: ترقی پسند، رجعت پسند اور وہ لوگ جن کی اصل مشکوک ہو۔ ترقی پسند سپکٹرم کے درمیان میں کمیونسٹ براجمان تھے۔ ان کے ایک طرف انتہا پسند بائیں بازو والے اور دوسری طرف شائستہ اور اعتدال پسند جمہوریت کے داعی سوشلسٹ تھے۔ ان سب کے درمیان یہ بات مشترک تھی کہ یہ سب اپنے آپ کو کھلے ذہن کے حامل، تہذیب یافتہ، بنی نوع انساں کے مستقبل کے بارے میں رجائیت پسند اور اس کی بہتری کے لیے کام کرنے والے اصحاب خیر سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں دوسرے لوگ اس کے برعکس رجعت پسند تھے جن میں بنیادی طور پر وطنیت پرست اور قومیت پرست اور اگلے نمبر پر اسلام پسند، جو ان کے نزدیک بندروں اور نوع انسانی کے درمیان کی گمشدہ کڑی تھے، شامل تھے۔ یہ دراصل ماضی کی خرافات سے وابستہ پس ماندہ لوگ تھے جنہیں کمزوروں کے درد و آلام اور عورتوں کی حالت زار سے کوئی سروکار نہیں تھا، انہیں اس بات کا شعور نہیں تھا کہ تاریخ کا دھارا کس طرف رخ کر رہا ہے اور نہ اس بات کا احساس تھا کہ بالآخر یہ لوگ تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیے جائیں گے۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان ترقی پسند لوگوں ہی کی نظر میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو مشکوک تھے۔ میری شومئی قسمت کہ مجھے بھی انھی میں شمار کیا گیا اور میں تا حال ''آدھا ترقی پسند'' ہی ہوں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مجھے غریبوں، عورتوں اور مغلوب و مقہور قوموں کے دفاع میں آواز اٹھانے اور سرگرم عمل ہونے کی وجہ سے اس لقب عالی سے سرفراز کر دیا جاتا جب کہ میں عرب اور مینٹیلٹی جیسے حقیر بالادستانہ/سرمایہ دارانہ (Bourgeois/ Chauvinistic) افکار کا حامل تھا اور اس بات کا مذاق اڑاتا تھا کہ ''مذہب عوام کا افیون ہے''۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ترقی پسندوں کے لیے فخر کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ روئے زمین کے ۶ء۲ حصہ پر کمیونسٹ حکومتوں کا غلبہ تھا۔ کمیونسٹ جماعتوں کا دائرہ مغربی ممالک تک وسیع ہو چکا تھا۔ ترقی پسند قوتیں ہی استحصال، نسل پرستی اور استعمار کے خلاف انقلابات کی قیادت کر رہی تھیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں ترقی پسندوں ہی کا غلغلہ تھا اور سوویت یونین پہلی مرتبہ ایک عورت کو خلا میں بھیج رہا تھا۔ اس پر مستزاد تمام میدانوں میں سائنس و ٹیکنالوجی کی غیر معمولی پیش رفت تھی۔ یہ سب اس بات کی علامت تھی کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور معیشت کے میدان میں ہمیشہ سیلاب کی طرح آگے کی جانب پیش قدمی ہوتی ہے اور اسے کوئی روک سکنے پر قادر نہیں ہے۔

آج ترقی پسندوں کے لیے ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ احساس برتری میں مبتلا رہیں۔ حالات نے ان کے اوہام و خیالات کی تردید کر دی ہے اور وہ بسر و چشم دیکھ رہے ہیں کہ مذہب جسے وہ ''لوگوں کا افیون'' کہتے تھے، پوری قوت کے ساتھ روسی معاشرے سمیت تمام معاشروں میں لوٹ رہا ہے اور عورتیں خود اپنی مرضی سے حجاب اختیار کر رہی ہیں، جب کہ ان کے نزدیک عورت کی ترقی کی علامت اس کے اسکرٹ کا چھوٹا ہونا اور اس کے گھٹنوں کا عیاں ہونا تھا۔ ان ساری تبدیلیوں سے آگے بڑھ کر سرمایہ دارانہ نظام کی وہ جیت ہے، جس نے ہم سب کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے، اسّی کی دہائی میں ان کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی پارٹی کے خلاف بولونیا کے مزدوروں کی بغاوت، کمیونسٹ پارٹیوں کے زوال اور ان کی سب سے بڑی پارٹی ''چینی کمیونسٹ پارٹی'' کے سرمایہ دارانہ نظام کے سب سے بڑے حامی و نگہبان کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد ان ترقی پسندوں کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں!

اسلام پسندی کی نمایاں پیش رفت نے ان کے تمام اعتقادات کو غلط ثابت کر دیا ہے لیکن وہ اپنے افکار پر نظر ثانی کرنے، اس صورتحال کے اسباب پر غور کرنے اور اپنے نظریات میں موجود نقائص اور خامیوں کا سراغ لگانے کے بجائے اپنی روش پر قائم ہیں۔ ان کا یہ ردعمل کس قدر افسوس ناک ہے۔ آخر کار ''ظلمت پسندوں'' کے لیے ان کا بغض انہیں اس حد تک لے گیا کہ انہوں نے استبدادی قوتوں سے ناطہ جوڑ لیا اور تونس میں اپنے بہترین نظریہ سازوں، کارکنوں کو ان کے جلادوں کے حوالے کر دیا اور انقلاب کے علمبرداروں پر ہی شب خون مارنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود نہ کوئی چیز انہیں فائدہ دے سکی، نہ ان کی مغلوبیت کو روک سکی اور نہ یہ خوش خبری دے سکی کہ روئے زمین سے مکمل طور پر محو ہو جانے سے یہ لوگ بچ سکیں گے۔

کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ پھر ایسی ایمبولنس پر گولہ باری کیوں کر رہے ہو جس میں صرف ایک لاش ہے، یا ایسے مریض کو کیوں نشانہ بنا رہے ہو جو خود اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے؟ یہ اس لیے کہ سہل موت دینا ڈاکٹر کا کام نہیں ہے۔ اس کے حسن اخلاق اور پیشے کی اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ جس قدر غیر جانبداری کے ساتھ ممکن ہو، وہ مریض کی تشخیص کرے اور جس قدر نرمی کے ساتھ ممکن ہو اس کی صحت بحال کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے ہمیشہ اسی بات کی کوشش کی ہے کیونکہ میں اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ دنیا کو آج ترقی پسندی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، مگر ایک بہت مختلف نوعیت کی ترقی پسندی کی۔

ہم یہ یاد دلا دیں کہ ترقی پسندی اپنے رائج مفہوم میں فرانسیسی لفظ "Progressisme" کا ترجمہ ہے اور یہ لفظ Progres سے مشتق ہے۔ سب سے پہلے اس کا استعمال فرانسیسی مصنف Rabelais نے ۱۶۴۵ء میں کیا۔ اب ہمارے سامنے ایک مغربی بالخصوص فرانسیسی تصور ہے، جس کا ارتقا اس زمانے میں ہوا جسے عہد روشن خیالی (۱۷۱۵ء تا ۱۷۸۹ء) سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کے بڑے نظریہ سازوں میں دو فلسفی ڈیڈروٹ Diderot اور کونڈورسیٹ Condorcet تھے۔ بعد کے دور میں یہ تصور پورے یوروپ میں عام ہو گیا اور انیسویں صدی کے آخر سے اسے پورے طور پر مارکسی استعمال کرنے لگے۔ پھر یہ پوری دنیا میں پھیل گیا اور بیسویں صدی کے دوران یہ تصور وطن پرستی، اشتراکیت اور جمہوریت جیسے دیگر تصورات کے ساتھ ہم عربوں تک پہنچا۔ ہم آج تک افکار و اقدار کے صارف ہیں، اس بات کا انتظار کرتے ہوئے کہ اللہ اس امت کے لیے علم و معرفت کے دروازے کھولے گا تا کہ یہ تاریخ کے متاثرین کے مقام سے نکل کر دوبارہ تاریخ سازوں میں شامل ہو۔

اس تصور پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ تین اہم اعتقادات پر مشتمل ہے، جو مختلف نوعیت کی ترقی پسند سمجھی جانے والی حزب اختلاف کی سیاسی تحریکوں اور برسر اقتدار حکومتوں کے لیے فکری مرجع اور مضبوط اخلاقی محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ یقین کہ ترقی ایک قطعی اور ناگزیر چیز ہے۔

یہ یقین کہ یہ ہمیشہ اپنے جلو میں خیر ہی لاتی ہے۔

یہ یقین کہ یہ نہ صرف انسان اور معاشرے کی بہتری کی ضامن ہے بلکہ ان دونوں کی فطرت تبدیل کرنے پر قادر بھی ہے۔

پہلی کمزوری: قطعیت

ترقی پسند اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ تیر کی طرح ہے، جو ایک مرتبہ کمان سے نکل جائے تو اسے روکنا ناممکن ہے اور اس کا رخ ہمیشہ آگے کی سمت ہوتا ہے۔ بھلا کون ایسے تیر کو جانتا ہے جو کمان سے نکلنے کے بعد رک گیا ہو یا پیچھے کی طرف مڑ گیا ہو؟ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید میں مثالیں موجود ہیں۔ طب وصحت کے میدان کو لے لو۔ بیماریوں کے علاج ومعالجے کے میدان میں جو زبردست پیش رفت ہوئی ہے اس کا کون انکار کرسکتا ہے؟ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ دس ہزار سال قبل انسان کی اوسط متوقع عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ آج یہ ترقی یافتہ ممالک میں اسّی کی دہلیز عبور کرنے کو ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ ایک ایسا دعویٰ بھی ہے جو سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ کیا سوویت یونین کی ''یقینی'' پیش رفت جاری رہی اور سامراجیت پر اس کے غلبہ پر منتج ہوئی؟ کیا کسی ملک میں استحصال اور غلامی کا خاتمہ ہوگیا یا محض اس کی شکلوں اور شدت میں تبدیلی آئی ہے؟ آج جب کہ ہم کورونا کی وبا اور گلوبل وارمنگ (عالمی حدت) کا سامنا کررہے ہیں، کون یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ موجودہ معاشرے ''یقینی طور پر'' اپنے مطلوبہ مستقبل کی جانب فاتحانہ پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے؟ اب ہم بمشکل ہی مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ہماری ساری تمنا بس یہی ہوتی ہے کہ معاملات جیسے ہیں ویسے ہی باقی رہیں۔

دوسری کمزوری: سائنس اور ٹیکنالوجی کی پرستش

افسوس کہ تاریخ کے تجربے سے دو ایسی باتیں واضح ہوئی ہیں جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھیں۔ پہلی بات یہ کہ کسی ملک میں لاکھوں لوگوں کو غریبی سے نجات دلانے کی خاطر بے تحاشا فیکٹریاں بنانے کا نتیجہ ماحولیات کی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مغربی ممالک، چین اور ہندوستان میں یہی ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سستی اور ہر ایک کے لیے دستیاب بجلی کو یقینی بنانے کے لیے جو جوہری توانائی ایجاد کی جاتی ہے اس کے ساتھ ہی روئے زمین سے زندگی کا نام ونشان مٹا دینے کی قدرت رکھنے والے ہزاروں ایٹم بم بھی جمع کیے جاتے ہیں۔ راتوں میں شہروں کو روشن کرنے والی بجلی کا استعمال لوگوں کو تعذیب کا نشانہ بنانے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخی تجربے کی پیش قدمی کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق ہمارا یہ خواب کہ یہ صرف خیر ہی کا باعث ہوسکتے ہیں، آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا اور اکیسویں صدی میں ہر دیکھنے والے پر یہ واضح ہوگیا کہ ان دونوں کا برائی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو تعلق دھوپ میں چلنے والے کا سائے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی کو خیر کے لبادے میں شر کہہ سکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہم اسی شاخ کو کاٹنے جارہے ہیں جس پر ہمارا آشیانہ بنا ہوا ہے، یعنی ہم اسی ماحول کی بربادی کے درپے ہیں جس کے بغیر روئے زمین پر زندگی ممکن نہیں ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے سراپا خیر ہونے کے بارے میں ہمارے اعتماد کو متزلزل کرنے کا دوسرا سبب وہ منظرنامہ ہے جسے میں ''جوے پر رکھی گئی قیمت میں اضافہ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس قاعدہ کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے: جس قدر ٹکنالوجی کی صلاحیتوں اور اس کے فائدوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اس سے وابستہ خطرات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر ہماری جدت اور تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اور متوازی طور پر ہماری خرابی وبربادی کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی طرح میڈیا کے بے شمار فائدے ہیں لیکن ساتھ ہی جھوٹی خبروں، افواہوں اور نفرت انگیز باتوں کو پھیلانے میں اس کا نہایت تباہ کن کردار ہے۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ میڈیا ایک خوفناک ہتھیار ہے، جو ظالموں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کی نگرانی (surveillance) اور ان کے دماغوں سے کھیلنے کا کام لیں۔ ویڈیو گیم انڈسٹری کے جرائم ناقابل ذکر ہیں، جسے چلانے والے لاکھوں لوگوں کو اس کی لت میں مبتلا کرکے کروڑوں روپے کمارہے ہیں۔ یہ ویسی ہی صورت حال ہے جیسی منشیات فروشوں اور اس کے صارفین کی ہوتی ہے۔ مصنوعی دہانت (Artificial Intelligence) کے میدان میں ہونے والی پیش رفت سے نہ صرف دنیا بھر میں لاکھوں ملازمتوں کو بلکہ خود انسان کے موجودہ مقام ومرتبے ہی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی ہی ایجاد کا اسیر بن جائے اور اسی کا غلام بن کر رہ جائے جسے وہ اپنا غلام سمجھتا ہے۔

تیسری کمزوری: ترقی اور ارتقاء کے بیچ التباس

جس بنیادی مقدمے پر ترقی پسند فکر کی عمارت تعمیر ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان ''ظلمت پسندی'' یعنی ''مذہبی خرافات سے جس کی زنجیروں میں وہ لمبی مدت تک جکڑا رہا'' بتدریج آزاد ہورہا ہے اور ترقی پسندوں کی سربراہی میں جاری سیاسی نظاموں کی بدولت نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کے حالات زندگی بہتر ہوجائیں گے، بلکہ ایک نیا انسان تخلیق ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب تک کی تاریخ نے یہی بتایا ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں مغربی معاشروں میں غیر معمولی رفتار سے سائنسی علوم کی نشوونما، موثر دواؤں کی کثرت اور حالات زندگی کو بہتر بنانے والے بے شمار آلات کے ظہور کے باوجود نہ افراد کی فطرت میں کوئی بہتری آئی ہے اور نہ سماج کی فطرت میں۔ اس کی سب سے سچی دلیل ''ترقی یافتہ'' معاشروں کے نوآبادیاتی جرائم اور دوسری عالمی جنگ کے دوران نسل کشی کے کیمپوں میں ان کی بربریت ہے، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ ترقی اور ارتقا کے درمیان فرق کیا جائے کیونکہ ہمیشہ ان دونوں تصورات میں التباس پیدا ہوجاتا ہے۔ ترقی سے مراد مادی میدان میں ترقی ہے اور ارتقا سے مراد اخلاقی میدان میں ارتقا ہے۔ کیا ایمیزون بیسن اور نیوگنی کے پہاڑوں پر بسنے والے قبائل پر تھوپی گئی ترقی کو ہم ارتقا کہہ سکتے ہیں؟ یا اس کے برعکس یہ ان کے ساتھ پیش آنے والا سب سے بڑا سانحہ ہے؟ بالکل اسی طرح کا سانحہ جو شمالی امریکا کے قبائل کے ساتھ پیش آیا، جن کا ترقی کے باعث کوئی ارتقا نہیں ہوا بلکہ اس ترقی نے ان میں سے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جو لوگ ان بستیوں میں محصور رہ گئے تھے جنھیں سب سے زیادہ ''ترقی یافتہ'' انسانوں کی حرص نے ان کے لیے چھوڑ دیا تھا، ان کے لیے موٹاپے کی بیماری اور شراب کی لت کا سبب بنی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقی واقعی ارتقا کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے اور اس کے بغیر بھی، یہاں تک کہ وہ ایسے تہذیبی ارتداد کی صورت بھی اختیار کرسکتی ہے، جو ترقی اور تمام ترقی پسندوں سے نفرت کا باعث بنے۔ اسٹالن اور پول پاٹ کی حکومتوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان حکومتوں کے وحشی پن کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ دونوں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہ تاریخ انسانی کے سب سے عظیم منصوبے یعنی نئے انسان کی تخلیق میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس ''عظیم منصوبے'' میں رکاوٹ ڈالنے والوں کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ''پرانے'' انسان کے لاکھوں نسخے نئے انسان کے استقبال کی راہ ہموار کرنے کے لیے قربان کردیے جائیں کیونکہ یہی تاریخ کے معرکے میں سب سے آخری اور بلند مرحلہ ہے۔

ترقی پسندی کا یہ سادہ نظریہ جس چیز کو نظرانداز کردیتا ہے اور جو حیاتیاتی علوم کے محققین کے درمیان آج ایک معروف

حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ انسانی نسل جسے Homo Sapiens کہا جاتا ہے (جس کی سات ارب کا پیاں آج موجود ہیں)، اس میں لاکھوں سالوں سے کوئی جسمانی تبدیلی نہیں واقع ہوئی، نہ اس میں کسی نئے عضو کا اضافہ ہوا اور نہ ہی اس کے دماغ کا حجم بڑھا۔ اسی طرح عام تصور کے برخلاف اس کی ذہانت میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا، صرف اس کے تجربات بڑھ گئے ہیں۔ پتھروں اور ہڈیوں سے آلات بنانے کے لیے اور ہر طرح کے خطرات سے پُر دنیا میں شکار کے طریقے ایجاد کرنے کے لیے آغاز تاریخ کے انسان میں جو ذہانت مطلوب تھی وہ اس ذہانت سے کم نہیں تھی جس کی اس دور کے انسان کو راکٹ بنانے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس پوری تاریخ کے سفر میں انسان نے اسی طرح اپنے تمام رویوں اور طرز ہائے عمل کو ان کی خصوصیات اور نقائص سمیت باقی رکھا ہے۔ یہ معاملہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ شاید فطری یا مصنوعی حیاتیاتی تغیر کے نتیجے میں ایک نئی انسانی نسل ظہور میں آجائے۔ لیکن موجودہ انسان کی فطرت میں کسی سیاسی نظام کی بدولت کسی تبدیلی کے امکان کا تصور کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا یہ کہنا کہ لباس کی خوب صورتی سے اس جسم کے اعضا خوب صورت ہو جائیں گے جسے وہ ڈھانپے ہوئے ہے۔

اس تشخیص کے بعد ہم کیا نتیجہ اخذ کریں؟ کیا ترقی پسندی سے متعلق ہر چیز سے پوری طرح دوری اختیار کر لی جائے؟ یہاں ممکن ہے کہ ہم میں سے آدھے شر پسند لوگ ان لوگوں سے جواب بھی اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں، یہ کہیں: تم اپنے حریفوں کو تاریخ کے جس کوڑے دان کا خوف دلا رہے تھے وہ تمہارے لیے سراپا انتظار ہے۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم سے آدھے خیر پسند لوگ ان سے یہ کہیں: جو اجتہاد کرتا ہے اور صحیح رائے پر پہنچتا ہے اس کے لیے دو اجر ہیں اور جو غلطی کر بیٹھتا ہے اس کے لیے ایک اجر ہے اور تم لوگوں سے متعلق ہم یہی کہیں گے کہ آدھا اجر کافی ہے اور کسی معاملے میں اختلاف رائے دوستی کو ختم نہیں کرتا۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں، اس لیے کہ ہم نے صرف آدھے خالی گلاس پر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسندی نے جن خوابوں کی دنیا سجائی تھی ان میں سے بیشتر کی تعبیر میں وہ ناکام ثابت ہوئی۔ لیکن مجھے بتاؤ! کون سا ایسا دوسرا نظریہ یا مذہب ہے جس نے اپنے سارے وعدے پورے کر دیے ہوں؟ کیا سماجی تحفظ، انسانی روزگار کے لیے سازگار حالات کی فراہمی، اجرتوں میں استحصال کی کمی، تعلیم اور صحت کی ہر ایک کے لیے عام فراہمی، عورتوں اور کالونیوں کی آزادی جیسی حصولیابیاں ترقی پسندوں کے بہت سارے کارناموں میں سے نہیں ہیں؟

تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کیا وہ مسائل ختم ہو گئے جنہیں ترقی پسند حل کرنا چاہیے تھے؟ کیا دوسروں نے غربت، جہالت اور ظلم کے مثلث کا کامیاب حل ڈھونڈ لیا ہے؟ کیا ہمیں مستقبل کے سلسلے میں امید کی کرن کی ضرورت نہیں ہے؟ اور کیا اس بات پر کسی قدر اعتماد کی ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ صرف لایعنی حوادث کا تسلسل نہیں ہے؟ بے شک تمام مسائل اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہمیں اب بھی اس یقین کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مستقبل کی صورت گری کر سکتے ہیں اور ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس و خاشاک کی طرح نہیں ہیں۔ بے شک ہمیں ایسے وژن کی ضرورت ہے جو ترقی پسندی کے خواب اور اس کے اولین منصوبے یعنی ملکی و عالمی سطح پر سماجی عدل، انصاف اور تکریم انسانیت کی آخری حد تک فراہمی کو جاری رکھے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں ایسے وژن کی ضرورت ہے، جس میں ذرا سی عاجزی بھی ہو اور جو یہ قبول کرتا ہو کہ تاریخ تمام امکانات کے لیے ایک کھلی فضا ہے۔۔۔، اور یہ کہ ہمیں انسان کی خصوصیات اور نقائص اور اس کی مختلف ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔ انہی ضروریات میں اس کی دینی ضرورتیں بھی ہیں، جن کی اہمیت تسلیم نہیں کی گئی ہے۔۔۔، اور یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے کچھ خطرناک پہلو ہیں جنہیں ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔۔۔، اور یہ کہ گھٹیا وسائل سے اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہے، اور یہ کہ انسان کی آزادی، مختصر ترین مدت ہی کے لیے سہی، اسے غلام بنا کر حاصل نہیں کی جا سکتی، چاہے ایسا کسی ایسی اعلیٰ مصلحت کے نام پر ہی کیوں نہ کیا جائے، جس سے صرف چند ترقی پسند اشرافیہ واقف ہوں۔۔۔ اور یہ وژن اس بات پر یقین رکھے کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادی کے منصوبے کو ایک چھوٹا قدم ہی سہی آگے بڑھائیں اور کھنڈرات کی تعمیر نو کا کام انجام دیں، کیونکہ یہی ایک چیز ہے جو ناگزیر ہے۔ بے شک ہمارے عرب معاشروں کو جن کے پاس نہ کوئی خواب ہے اور نہ کوئی کمپاس، جس چیز کی ضرورت ہے وہ بالیدہ ترقی پسندی ہے، جس کی نظریہ سازی اور جسے عمل میں لانے کا کام ایسے لوگ کریں جو ان تلخ جائزوں کو قبول کرنے والے ہوں، اور جو تاریخ سے سیکھنے والے ہوں نہ کہ تاریخ کی غلطیوں کو دہرانے والے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔ ترجمہ: سدید از ہر فلاحی)

بقیہ: سیموئیل پیٹی کا قتل۔۔۔

سلوک اور غربت کی کہانی سننے کا نام ہے، محروم طبقے کو حق ہے کہ وہ اپنی بات کرے۔ مسلمان اور ان کے غیر مسلم پڑسیوں کو کچی آبادیوں میں طویل عرصے سے خاموش کرا دیا گیا ہے۔ ان کے مسائل اور باتیں بہت کم ہی عوامی بحث کا موضوع بن پاتے ہیں۔ ان کی شکایات کم ہی سیاستدانوں اور مشہور شخصیات کی توجہ حاصل کر پاتی ہے۔ آزادئ اظہار کو کئی خطرات لاحق ہیں، جن میں سے ایک کمزور طبقے کی باتوں کو اَن سنا کر دینا ہے۔ اگر اس سانحے سے قوم کو کچھ سیکھنا ہے تو دیکھنا ہوگا کہ کون لوگ ہیں جن کی تقریریں نشر ہونے سے بہت پہلے ہی ایک خطرہ بن جاتی ہیں، جس کے نتیجے میں پورے معاشرے کو مایوسی اور ناراضی گھیر لیتی ہے۔ آزادئ اظہار کے تحفظ کے لیے سب کی بات سننا ضروری ہے۔ ہر معاشرے کے لیے لازم ہے کہ لوگوں کی بات کو سنا جائے، معاشرے میں موجود ہر طبقے کی سوچ یکساں نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی لوگوں کے درمیان مساوات کو فروغ دیا جانا ضروری ہے۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Samuel Paty murder: The right to offend Muslims is being weaponised".
("middleeasteye.net". October 22, 2020)

●●●

بقیہ: بھارتی مسلمان ووٹر۔۔۔

بھی سوال اٹھا رہے ہیں، لگتا ہے کہ انتخابات میں شرکت کر کے وہ گناہ عظیم کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ معروف صحافی معصوم مراد آبادی کے مطابق سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کو ایک ریوڑ کی طرح ہانکتی رہی ہیں۔ اگر مسلمان ان استحصالی پارٹیوں سے دامن چھڑا کر اپنی سیاست اور اپنی قیادت کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور کوئی خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے بل پر سیاست میں کامیابی حاصل کرتا ہے، تو اس کو بی جے پی کا ایجنٹ بتا کر معتوب کرایا جاتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان رہنما اپنے اندر جھانک کر فیصلہ کریں کہ کیا سیکولر پارٹیوں کا دُم چھلہ بن کر وہ قوم کا بھلا کر سکیں ہیں؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ایک متبادل حکمت عملی تیار کرنے پر سنجیدہ غور و خوض کیا جائے؟ وزیر اعظم مودی اور ان کی پارٹی کے رہنما بھی اپنے ضمیر سے سوال کریں کہ کیا ۲۰ کروڑ مسلمانوں کو خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھ کر وہ بھارت کو ایک سپر پاور بنانے کا خواب پورا کر سکیں گے؟

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۸ نومبر ۲۰۲۰ء)

●●●

نگورنو کاراباخ: سہ فریقی معاہدے کا متن

صدر جمہوریہ آذربائیجان الہام علی یوف، وزیراعظم جمہوریہ آرمینیا نکول پشنیان اور صدر روس ولادیمیر پوٹن کے درمیان درج ذیل نکات پر اتفاق ہوا ہے:

۱۔ نگورنو کاراباخ کے علاقے میں ۱۰ نومبر ۲۰۲۰ء کو ماسکو کے وقت کے مطابق رات ۱۲ بجے مکمل جنگ بندی ہوجائے گی۔ جمہوریہ آذربائیجان اور جمہوریہ آرمینیا جو معاہدے میں ''طرفین'' کہلائیں گے، اپنی موجودہ جگہوں پر رک جائیں گے۔

۲۔ ۲۰ نومبر ۲۰۲۰ء تک ضلع ادغام آذربائیجان کو واپس کر دیا جائے گا۔

۳۔ ۱۹۶۰ فوجیوں، ۹۰ بکتر بند گاڑیوں، ۳۸۰ گاڑیوں اور خصوصی دستوں پر مشتمل روسی امن افواج جنگ بندی لائن اور لاچن گزرگاہ پر تعینات کی جائیں گی۔

۴۔ روس کی امن افواج کی تعیناتی آرمینیائی افواج کے انخلا کے ساتھ ہی عمل میں آئے گی۔ یہ تعیناتی ۵ سال کی مدت کے لیے ہوگی اور اگر اس مدت کے گزرنے کے بعد طرفین میں سے کسی نے بھی معاہدے کی شق نمبر ۶ کو ختم کرنے کی تجویز نہیں دی تو یہ تعیناتی خود بہ خود مزید ۵ سال کے لیے بڑھ جائے گی۔

۵۔ طرفین کی جانب سے معاہدے پر عمل درآمد پر نظر رکھنے کے لیے ایک مرکز برائے قیام امن وتعمیر کیا جائے گا، جو جنگ بندی کی نگرانی کرے گا۔

۶۔ جمہوریہ آرمینیا ۱۵ نومبر ۲۰۲۰ء تک کلبجار کا علاقہ اور یکم دسمبر ۲۰۲۰ء تک لاچن کا ضلع جمہوریہ آذربائیجان کے حوالے کردے گا۔ ۵ کلومیٹر وسیع لاچن گزرگاہ جو شوشہ کے علاقے سے گزرے بغیر آرمینیا اور نگورنو کاراباخ کے علاقے کو ملاتی ہے، روسی امن افواج کی نگرانی میں رہے گی۔

طرفین کی جانب سے اتفاق کیا گیا ہے کہ اگلے ۳ سال میں لاچن گزرگاہ سے آرمینیا اور نگورنو کاراباخ کو ملانے کے لیے ایک راستے کا منصوبہ بنایا جائے اور اس کی حفاظت بھی روسی امن افواج کریں گی۔

جمہوریہ آذربائیجان، لاچن گزرگاہ سے گزرنے والے لوگوں، گاڑیوں اور سامان کی حفاظت کی ضمانت دے گا۔

۷۔ پناہ گزین اور آئی ڈی پیز اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزین کی زیر نگرانی نگورنو کاراباخ اور اس سے متصل علاقوں کو واپس آسکیں گے۔

۸۔ طرفین جنگی قیدیوں، مغویوں، دیگر گرفتار افراد اور لاشوں کا تبادلہ کریں گے۔

۹۔ خطے میں تمام ٹرانسپورٹ پر عائد پابندی ختم کردی جائے گی۔ ناخچیوان کے خود مختار علاقے اور جمہوریہ آذربائیجان کے مغربی علاقے کے درمیان راستوں کی حفاظت کی ضمانت جمہوریہ آرمینیا دے گا۔ روسی سیکورٹی سروس کے بارڈر گارڈ اس راستے پر نقل وحمل کی نگرانی کریں گے۔

آذربائیجان کے مغربی علاقے اور ناخچیوان کے خودمختار علاقے کے درمیان رابطے کے لیے نقل وحمل کے نئے ذرائع تعمیر کیے جائیں گے۔

("en.kremlin.ru". November 10, 2020)

●●●

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

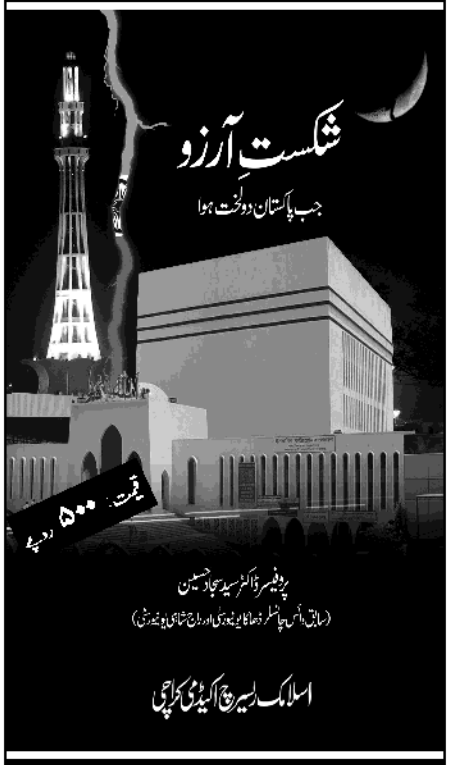

ملنے کا پتا: اکیڈمی بک سینٹر: ڈی۔۳۵، بلاک۔۵
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ (۰۲۱)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہوجائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں' تاکہ پچھلے پتے پر جا کر پرچہ ضائع نہ ہو۔ اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو ''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہوگیا ہو یا اب اِسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جاسکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''معارف فیچر'' جاری ہوجانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب/ صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاء اللہ ملتا رہے گا تا آنکہ وہ خود منع کردیں۔ اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں' کچھ اور ہوسکتا ہے۔ مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہوجانا۔ لہٰذا ''معارف فیچر'' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ ہم آپ کے تعاون' دعاؤں' مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔ (مدیر)

نوٹ:۔ زرِتعاون اور عطیات کے چیک/ ڈرافٹ وغیرہ پر
Islamic Research Academy Karachi
لکھے/لکھوائیے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:
D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

سیموئیل پیٹی کا قتل: مسلمانوں کو ٹھیس پہنچانے کا ایک ہتھیار

Myriam François

۴۷ سالہ فرانسیسی استاد سیموئیل پیٹی کے مسلمان انتہاپسند کے ہاتھوں قتل نے پورے فرانس کو صدمے اور اضطراب سے دوچار کردیا۔ سیموئیل پیٹی کی موت اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بڑا نقصان ہے۔ جبکہ قوم کے لیے یہ ایک تازہ ترین صدمہ ہے، چارلی ایبڈو پر حملہ بھی قوم کے لیے ایک صدمہ تھا، جس کا مقدمہ ابھی چل رہا ہے۔ یعنی ابھی پرانے زخموں کو بھرنا بہت دور کی بات ہے۔ سیموئیل پیٹی کی جانب سے اظہار رائے کی آزادی کے حوالے سے کلاس کے دوران نبیٔ کریمؐ کا کارٹون دکھایا گیا، جس پر مشتعل ہوکر ۱۸ سالہ چیچن عبداللہ عنصروف نے مبینہ طور پر سیموئیل پیٹی کا سر کاٹ دیا۔ جمعہ کو سیموئیل پیٹی کا قتل ہوا، جس کے بعد ہزاروں افراد نے آزادی رائے کے حق میں ریلیاں نکالیں اور وہ اس یقین کے ساتھ اکٹھے ہوئے کہ اس سے فرانسیسی شناخت کو خطرہ ہے۔ صدر ایمانوئل میکرون نے اس حوالے سے کہا کہ اب دوسری طرف کے لوگوں کے خوفزدہ ہونے کا وقت ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس تقریر نے تقسیم کے عمل میں اضافہ کیا۔ جس کے بعد دہشت گردوں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نگرانی بڑھا دی گئی۔ اس قتل کے بعد سینئر وزراء نے حملے سے منسلک تنظیموں اور مساجد کو بند کردینے کا وعدہ کیا، قطع نظر اس کے کہ یہ تعلق ثابت ہوتا بھی ہے یا نہیں، ان کے اقدام سے فلاحی تنظیمیں اور اسلام فوبیا کے خلاف کام کرنے والے گروپوں کو بھی غیر منصفانہ طور پر دہشت گرد قرار دے کر نشانہ بنانے کا تاثر بہت گہرا ہوگیا۔ قوم پرستی کا نعرہ لگا کر کہا گیا کہ فرانس کی اقدار پر حملہ کیا گیا اور تمام شہریوں کو ایک اَن دیکھے دشمن کے خلاف دفاع کے لیے نکلنا چاہیے۔ ایسا دشمن جو مسلمان ہونے کی وجہ سے متشدد ہے۔ اس سیاسی منطق کے مطابق تمام مسلمان مشکوک قرار پائے اور ہر مذہبی علامت کو خوف کی علامت بنا دیا گیا۔ حالانکہ تحقیق کرنے والے بتا چکے ہیں کہ مذہب انتہاپسندی کے سدباب کے لیے اہم ہتھیار ہے۔ اور اس بات کا کوئی مصدقہ ثبوت موجود نہیں کہ مذہب اور نظریہ پر تشدد انتہاپسندی کا بنیادی محرک ہے۔ ہمیشہ بنیاد پرستی کی نشاندہی ایک معاشرتی مسئلے کے طور پر کی جاتی رہی ہے۔ اب فرانس میں سیاستدانوں اور پنڈت ملک اور آزادی کے نام پر مسلمانوں پر مذہبی پابندیاں عائد کرنے پر روزانہ بحث کررہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ایرک زیمور ہیں، جن پر بار بار مسلمانوں کے خلاف نسلی منافرت پر اکسانے کے الزامات عائد کیے گئے، لیکن ان کی آزادانہ تقریر پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ فرانسیسی ٹی وی اور ریڈیو ان کے نفرت کے نظریے کا پھیلاؤ روزانہ کی بنیاد پر کرتے ہیں، صحافی کبھی سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی فرانس میں خانہ جنگی کی پیشگوئیاں کی جاتی ہیں۔ فرانس میں قوم پرستی کی لہر کوئی نئی بات نہیں، لیکن نسل پرست قومیت کی لہر ہم سب کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے، کیونکہ یہ ماحول انتہاپسندوں کے لیے سازگار ہے۔

فرانس کی حکومت مسلمانوں کو معاشرے سے الگ کرکے ان کا گھیرا تنگ کررہی ہے، عدم تحفظ کا شکار مایوس اور ناراض ذہنوں کو ریاست کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا بہت آسان ہے۔ سیموئیل پیٹی کے قتل نے معاشرتی اور معاشی پسماندگی، ثقافتی مخالفت اور امتیازی سلوک کی پرانی شکایتوں کو مزید بڑھاوا دیا ہے۔ کسی بھی کمیونٹی کے لیے اپنے ہم مذہب کے تشدد کا میڈیا میں جواب دینا ناممکن ہوتا ہے۔ فرانس کی جمہوریت کے ہاتھوں مسلمانوں کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب وہ پولیس کی بربریت، غربت، ملازمت میں امتیاز، مسلم شناخت سے نفرت کا سامنا کرتے ہیں تو مایوسی اور بڑھ جاتی ہے، جس کے بعد وہ سخت گیر گروہ کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ جنونی خود کو بنیادی حقوق سے محروم مسلمانوں کے مسیحا کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ سیاستدان جو غیر مسلم آبادی کے رہنما ہیں کی نظر میں حلال کھانا کھانا اور تیراکی میں پورے کپڑے پہننا کسی کا سر کاٹنے جتنا دہشت ناک ہے۔ اس واقعہ کو ایک ترقی پسند ایجنڈا دینے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا، مگر میکران نے انتہائی دائیں بازو کا ایجنڈا آگے بڑھایا ہے۔ میکران نے فرانسیسی شہروں کو تقسیم کیا، جعلی خبروں کو بڑھاوا دیا اور انتہاپسند، فرقہ پرست اور مسلمانوں کو ایک جیسا بتایا اور ان کا پیغام بہت واضح تھا کہ ''مسلمان ہی سب سے بڑی پریشانی ہیں''۔

۲۰۱۹ء کی ایک تحقیق کے مطابق انتہاپسندی کی بنیادی وجہ معاشرے سے الگ تھلگ ہونے کا احساس ہے۔ اس تحقیق کے شریک مصنف نفیس حامد کا کہنا ہے کہ ''معاشرے کی جانب سے دھتکارے جانے کے بعد انتہاپسند گروپس کے رویے میں مزید شدت آتی جارہی ہے''۔ یہ واحد تحقیق نہیں جس میں اس نتیجے پر پہنچا گیا ہے۔ ایک اور تحقیق مانچسٹر کے میئر اینڈی برنہم نے ۲۰۱۷ء میں اریانا حملوں کے بعد کروائی تھی۔ جس کے مطابق معاشرتی اتحاد کی کمی کو بنیاد پرستی کی کلیدی وجہ قرار دیا گیا اور اس مسئلہ کو معاشرہ مکمل طور پر نظر انداز کررہا ہے۔ فرانس موجودہ بگڑتی ہوئی صورتحال کا متحمل نہیں ہوسکتا، بلکہ ہم میں سے کوئی بھی اس صورتحال کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ سیموئیل پیٹی کے قتل کے بعد ایفل ٹاور کے نیچے دو مسلم خواتین پر سفید فام عورتوں نے ''گندے عرب'' کا نعرہ لگاتے ہوئے حملہ کردیا۔ اس کو نسل پرست حملہ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ حملہ مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد کی ایک مثال ہے، اس طرح کے حملوں میں اکثر مسلمان خواتین نشانہ بنتی ہیں۔ فرانس میں مسلمانوں کو کثیر الجہتی مسائل کا سامنا ہے۔ ان کو مذہبی شناخت کی بنیاد پر مسلسل نشانہ بنایا جارہا ہے۔ فرانسیسی مسلمان شہریوں کو درپیش بڑے مسائل حل کیے بغیر معاشرے کی جانب سے زبردست عدم مساوات کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ آزادیٔ اظہار کے بارے میں جاری بحث میں ہم کو فرانسیسی مسلمانوں کی رائے کم سننے کو ملتی ہے۔ مختلف تجربات اور خیالات کے بارے میں شاذونادر ہی سننے کو ملتا ہے، جس سے معاشرے کی مجموعی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے بجائے ہم فرماں بردار امام یا پھر انتہاپسندوں کے خیالات زیادہ سنتے ہیں، جن کو کم ہی لوگ سننا پسند کرتے ہیں۔

فرانس تاریخی طور پر دوسروں کو سمجھنے میں ناکام ہوگیا ہے، وہ آج پوری طرح فرانسیسی ہیں اور بجا طور پر ایک شہری، ایک مسلم، ایک نسل کے طور پر اپنی پوری شناخت کا مطالبہ کرتے ہیں اور جمہوریہ کی جانب سے ان کو اسی شکل میں قبول کیا جانا چاہیے اور اس کام کے لیے جدوجہد کی جانی چاہیے۔ گزشتہ ہفتے ہزاروں افراد نے سیموئیل پیٹی اور آزادیٔ اظہار کے حق میں فرانس بھر میں ریلیاں نکالیں، ہمیں ان ریلیوں میں لگائے گئے نعروں پر غور کرنا چاہیے۔ حقیقت میں سیموئیل پیٹی کے قتل جیسی پُرتشدد کارروائیاں آزادیٔ اظہار کے لیے اس وقت خطرہ بن جاتی ہیں جب لوگوں میں خوف و ہراس پھیلنے لگے۔ لیکن معاشرے کے محروم طبقے کو تو طویل عرصے سے بات کرنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ آزادی اظہار لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی عیاشی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ عدم تحفظ، بے روزگاری، امتیازی

باقی صفحہ نمبر ۱۴